ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

مئی ۲۰۱۵ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	رمضان المبارک کا پیغام	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	موجودہ بحران-اسباب وحل	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ سیرت	کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟ (قسط-۱۶)	تحریر: مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے جمیل احمد	۸
۴۔	تجزیہ	امت مسلمہ کا فکری بحران	تحریر: پروفیسر محمد الغزالی: ترجمہ: شان محمد ندوی	۱۰
۵۔	فقہی مباحث	اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور حکم شریعت (قسط-۲)	محمد قمر الزماں ندوی	۱۸
۶۔	فاتحین اسلام	سلطان صلاح الدین ایوبی	تحریر: عبدالمنعم الہاشمی، ترجمانی: محمد عالم ندوی	۲۷
۷۔	سیرت و سوانح	حضرت عمر فاروقؓ کی رواداری	ظفر دارک قاسمی	۳۵
۸۔	دل کی آواز	وقت کیا چاہتا ہے؟	محمد فرید حبیب ندوی	۳۸
۹۔	نقطۂ نظر	اسلامک بینکنگ اسلامی سے زیادہ ایک انسانی....	محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۴۱
۱۰۔	اصلاح معاشرہ	دینی واصلاحی جلسے: چند قابلِ توجہ پہلو	نایاب حسن	۴۵
۱۱۔	رمضان کا پیغام	ماہِ رمضان المبارک: نفس وروح کی تطہیر کا موسم	مولانا اسرار الحق قاسمی	۴۸
۱۲۔	ذکر رفتگاں	مثالی انسان-رفیع احمد علوی	پروفیسر ابوسفیان اصلاحی	۵۱
۱۳۔	تعارف و تبصرہ	مطبوعات جدیدہ		۶۰
۱۴۔	آخری صفحہ	میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۵۔	شعر و ادب	اب وہ کہاں اخلاص کی شمعیں اب وہ کہاں....	ڈاکٹر کلیم عاجز	۶۵

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

موجودہ بحران ـــــــــ اسباب وحل

ہمارے یہاں عام طور پر اسباب تخلف کا یک رخا تجزیہ کیا جاتا ہے، جو جس نظریہ سے متعلق ہے وہ اسی پہلو سے اسباب تخلف پر نظر ڈالتا ہے، حالانکہ دین مجموعۂ قوانین کا نام ہے، پوری حیات انسانی کے لئے ہر ناحیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو دستور مرتب کیا گیا اس کا نام ''الاسلام'' رکھا گیا ہے اور فرمایا گیا ان الدین عنداللہ الاسلام ،اب ظاہر ہے کہ ''الاسلام'' کی حکمرانی زندگی سے موت تک بلکہ موت کے بعد پیش آنے والے مسائل میراث تک کو محیط ہے، وہ عقائد کی بھی تعلیم دیتا ہے، ضروریات زندگی کے متعلق بھی ہدایات دیتا ہے، تعلیمی نظریہ رکھتا ہے، سیاسی رہنمائی کرتا ہے، حکومت وقضا کے احکام دیتا ہے، عبادات، معاملات، تجارت واقتصادیات اس کے ابواب ہیں، اخلاقیات کی تعلیم اس کا امتیاز ہے، دعوت وتبلیغ اس کے وظائف میں شامل ہے، کسی ایک جزء پر محنت اپنی کوتاہ دستی کے سبب تو اختیار کی جاسکتی ہے لیکن " الاسلام بضع و سبعون شعبة" سے پہلو تہی کوتاہ نظری کے سوا اور کیا کہلائے گی،

بہت افسوس کے ساتھ یہ بات عرض کرنی پڑ رہی ہے کہ آج ہماری جس قدر بھی کوششیں مختلف ناحیوں سے انجام پا رہی ہیں ان کی حیثیت محض پیوندکاری کے سوا کچھ نہیں، اگر یہ ہوتا کہ ہر کوشش کرنے والا اپنی کوشش محض اخلاص کی بنیاد پر کرتا اور خالص اللہ کی رضا کے لئے کوشش کرتا اور پھر سب اپنے اپنے میدان کار میں اسلام کی بالا دستی کے لئے اسلامی رنگ میں رنگ کر کوشش کرتے اور باہمی تعاون کو ہر آن ملحوظ رکھتے تو شاید بات بن جاتی اور ہماری یہ پیوندکاری کی مہم بھی کسی نہ کسی درجہ میں کامیاب ہوتی نظر آتی، لیکن سچائی اور تلخ سچائی یہ ہے کہ یہاں دین کے نام پر کوششیں کرنے والوں کے درمیان بعد المشرقین ہے، اکثریت کے نزدیک بس اپنے ہی کام کی اہمیت ہے، اپنی ہی تنظیم وتحریک کی سربلندی اور اپنے ہی علمی نظریہ کی ترویج مقصود ہے، اتحاد کے پردے میں اختلاف ملتا ہے، تعلیم کے بطن سے جہالت جنم لیتی ہے، تعمیری کوششوں سے تخریبی کام انجام پانا مقدر بنتا جارہا ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم غور وفکر کرتے وقت اسلام کی آفاقیت وکاملیت وجامعیت کو ملحوظ نہیں رکھتے، اضطرابی حالت میں بھی اگر کسی جزء دین کو اپنی محنت کا حصہ بنایا گیا تو آج بدلتے حالات کے بعد بھی ہم اسی اضطرابی حالت پر ہی

جمے رہنے کے لئے بضد ہیں، جبکہ صورت حال کچھ اس طرح ہمارے لئے بنتی جارہی ہے جس کا نقشہ قرآن مجید میں یوں کھینچا گیا ہے، أولم يروا أنا نأتي الأرض ننقصها من اطرافها (رعد۴۱)(ترجمہ:اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹائے چلے جارہے ہیں)اور وضاقت عليهم الارض بما رحبت وضاقت عليهم انفسهم (توبہ۱۱۸)(ترجمہ:اور زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں ان پر دوبھر ہوگئیں، ہم میں سے ہر شخص یہ واویلا مچاتا ہے کہ دنیا کے تمام تر وسائل پر یہودیوں کا قبضہ ہے جبکہ یہودی دنیا کی کل آبادی میں صرف ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب ہیں اور ان کے مقابلہ مسلمان ایک ارب ۵۰ کروڑ سے زیادہ ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ یہودیوں کے پاس کوئی پیغام نہیں، وہ آسمانی کتاب سے بھی منحرف ہو چکے بلکہ خود کتاب مقدس میں بھی ہزار ہا تحریفات کا ارتکاب کر چکے، ان کا ایمان محض مادیت پر ہے، روحانیت نام کی ان کے یہاں کوئی چیز نہیں، اس کے برخلاف مسلمان صاحب عقیدہ، صاحب کتاب اور صاحب پیغام ہیں، ان کے یہاں روحانی زندگی کے مظاہر نظر آتے ہیں، وہ قلت وکثرت پر بھی بھروسہ نہیں کرتے، پھر آخر اس ملک اور اس ملک سے باہر پوری دنیا میں مسلمانوں کے حاشیہ پر چلے جانے کے کیا اسباب ہیں؟؟

آج کی دنیا میں یہود ونصاریٰ فاتح قوم کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں، انہوں نے دنیا پر تسلط کے بعد ظلم وجرائم کو اپنا پیشہ بنالیا ہے، دنیا کی تاریخ میں صرف مسلمان ایسی قوم ہے جس نے فتح کے نشہ میں کبھی ظلم کو روا نہیں رکھا، باقی تمام اقوام کی تاریخ یہ ہے کہ وہ جب فتح سے سرشار ہوتی ہیں تو فاتح ہونے کے ساتھ ظالم بھی بن جاتی ہیں، قرآن نے اس تاریخ پر اس طرح اجمالی تبصرہ کیا ہے، قالت ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا أعزة اهلها أذلة هو كذلك يفعلون (نمل ٣٤) (ملکہ نے کہا بادشاہ جب کسی علاقہ (شہر وقریہ) میں داخل ہوتے ہیں تو اسے بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں اور اس کے باعزت اور اہل وجاہت لوگوں کو ذلیل وکمزور کر دیتے ہیں، یہ بھی ایسا ہی کریں گے) یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی قوم غالب ہوتی ہے تو اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی سیاست اس کا قانون سب غالب ہوتا چلا جاتا ہے، یورپ کی نشأۃ ثانیہ ہوئی، فرانسیسی استعمار قائم ہوا، برطانوی سامراج کی حکمرانی ہوئی، رشین بلاک بنا، اب امریکی بلاک کی حکمرانی ہے، اس پورے عرصہ کی تاریخ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو بیشتر مقامات پر ہماری بیشتر کوششیں محض دفاعی نظر آتی ہیں، ہم وسائل سے دست بردار ہوگئے، دارالاسباب میں رہ کر ہم صرف سیلاب بلاخیز کی ہلاکتوں کا تذکرہ کرتے رہے اور ہماری حکومتیں، ہماری قیادتیں اسی سیلاب کی رو میں بہتی رہیں، ہمارا نظام تعلیم، ہمارا نظام حکومت و قضا سب مغربیت زدہ ہوگیا، جس کے نتیجہ میں اس امت میں یا تو مغربیت والحاد زدہ افراد پیدا ہونے لگے یا پھر خالص بوریہ نشیں اپنے باقی ماندہ سرمایہ کی حفاظت میں مصروف نظر آنے لگے، دونوں کے درمیان اگر کوئی جماعت یا کچھ افراد

اسلام کی جامعیت کو سمجھ کر اصلاح حال کی کوشش میں مصروف ہوئے تو سچ یہ ہے کہ ان کو یہ دونوں طبقے قبول نہ کر سکے، الحاد زدوں اور سیکولرزم یا جاگیرداروں نے انہیں اپنا دشمن تصور کیا، جبکہ مذہبی رنگ میں رہ کر دین کی خدمت کرنے والوں نے انہیں کلی یا جزئی طور پر اپنے نظریہ کا مخالف گردانا، دن گذرتے گئے، بات بگڑتی گئی اور حالات یہ پیدا ہوئے کہ ہماری سیاست سرتاپا غلام ہوگئی، ہمارا تعلیمی نظام ایسا مفلوج ہوا کہ اس سے یا تو پیٹ کے پجاری بقول ایک مفکر "الحیوان الکاسب" (کماؤ جانور) نکلنے لگے جنہیں نہ دین کی شدبد، نہ دین کا خیال اور نہ دین سے سروکار، اور جو دوسرے نظام تعلیم سے میدان کار میں پہنچے وہ دنیا کا انتظام وانصرام سمجھنے اور سنبھالنے سے قاصر، انہوں نے شریعت کے سب ابواب کو پڑھا لیکن میدان عمل میں ان کا عمل مسجد ومدرسہ اور بعض معاشرتی معاملات تک محدود ہو کر رہ گیا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ہم دین ودنیا کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئے، جبکہ گزشتہ دوسو سال کی تاریخ سے قبل کبھی بھی ہمیں تعلیم میں ثنویت اور دوئی کا تصور نہیں ملتا، ایک وحدانی نظام تعلیم تھا جس کے فارغین دنیا کے نظام میں پیش پیش نظر آتے تھے، ایک طرف تو ہماری حالت زار یہ ہے کہ ہمارے تمام اسلامی ممالک میں کل ۵۰۰ یونیورسٹیاں ہیں جبکہ صرف امریکہ میں ۵۷۵۸ اور ہمارے ہندوستان میں ۸۴۰۷ یونیورسٹیز ہیں، ایک چھوٹے سے اسرائیل میں ۱۱۳۴ یونیورسٹی اور کالج ہیں، اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال یہ ہے کہ ہمارے کالج ویونیورسٹی جس نظام ونصاب کی اتباع کرتے ہیں اس سے سند فراغت لینے والے دین وملت کے کیوں کر خادم بن سکتے ہیں، اس ناحیہ سے اگر دیکھا جائے تو ہمارے یہ کالجز ویونیورسٹیز بھی امریکہ واسرائیل کے ایسے مراکز ہیں جہاں سے ہمارے متمول گھرانوں کے ذہین (Cream) نوجوان ان کے خادم بن کر نکلتے ہیں، بلکہ اب تو باقاعدہ عرب ممالک میں یہ تحریک زوروں پر ہے کہ وہاں سے حکومتی اخراجات پر طلبہ وطالبات کو امریکہ میں تعلیم دلانے کی غرض سے بھیجا جاتا ہے، یہ سلسلہ سب سے قبل مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد شروع ہوا تھا، جس کے نتائج مصر میں خوب ظاہر ہوئے اور اب عالم عربی میں ظاہر ہو رہے ہیں، رہا ہمارا وطن عزیز تو یہاں تفریق کی اعلیٰ مثال قائم ہے، مسلمانوں کا ایک طبقہ محض مادیت پسند ہے تو دوسرا اسباب دنیا کو بھی نہ اپنانے پر بضد، اگر کچھ کالجز یا ایک آدھ یونیورسٹیز مسلمانوں نے قائم بھی کی ہیں تو وہ مغرب زدگی کا شاہکار ہیں، وہاں بھی جو فکر راج کرتی ہے وہ پروفیشنلزم اور لامذہبیت سے ہی عبارت ہوتی ہے، ہمارے مدارس کا حال یہ ہے کہ وہ آج بھی ۱۸۵۷ء کے بعد والی اضطرابی حالت کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں۔

اسی طرح ہماری سیاسی صورت حال ہے، عالمی منظر نامہ پر ناکامی جگ ظاہر ہو چکی ہے، وطن عزیز میں بھی ہم حاشیہ پر ہیں، دوسروں کے لئے مہروں سے زیادہ ہماری کوئی حیثیت نہیں، اسمبلیوں اور پارلیمان میں ہماری جو نمائندگی نظر آتی ہے وہ اپنی پارٹی کے نظریات کی غلام ہوتی ہے، اس پر اپنے مذہبی تشخص اور ملی مفادات پر پارٹی کے نظریات کی

ترجیح لازم بلکہ فرض ہوتی ہے، جس کا تجربہ ومشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

دنیا جانتی ہے بلکہ یہ حقیقت تسلیم کرچکی ہے کہ اسلام ہی دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس کو باقی رہنا ہے اور پھلنا و پھولنا ہے، آج کل بالخصوص اس طرح کے سروے اور اس طرح کی رپورٹ آرہی ہیں کہ فلاں سال تک اور فلاں سنہ تک مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہوگا، اسی لئے ہمارے ملک میں مختلف طرح کے ڈھونگ رچے گئے، گھر واپسی کی مہم چلائی گئی اور پھر وزیر داخلہ کا یہ بیان سامنے آیا کہ حکومت کو تبدیلی مذہب مخالف بل لانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں، راقم کا ذہن اس طرف گیا کہ شاید اب تک جو حرکتیں اور جو میڈیا رپورٹس آرہی تھیں وہ اس خبر کی تمہید یا اس بیان کے لئے فضا ہموار کررہی تھیں، اور ان سب خبروں اور حرکتوں کا مقصد صرف تبدیلی مذہب مخالف بل لانا ہی ہے، ظاہر ہے کہ اس سے اس اسلام کی تبلیغ پر بھی قدغن لگے گی جس کے پھیلنے اور دنیا کا سب سے بڑا مذہب بننے کا ان کو خطرہ ہے بلکہ وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں، ابھی گذشتہ ہفتہ بھی وزیر داخلہ نے ایودھیا میں واضح الفاظ میں یہ کہا کہ ابھی راجیہ سبھا میں ہماری اکثریت نہیں اس لیے ہم رام مندر نرمان قانون نہیں بنا سکتے، ہم کئی ماہ قبل اپنے اداریہ میں لکھ چکے ہیں کہ بی جے پی راجیہ سبھا میں بھی اکثریت حاصل کرلے اس سے قبل ہی ہمیں ہوش کے ناخن لینا ہوگا، ملحوظ رہے کہ لوک سبھا ہو یا راجیہ سبھا کی اکثریت ان کا راستہ یوپی و بہار سے ہوکر جاتا ہے، اور ان دونوں صوبوں کے الیکشن آئندہ کی پالیسی طے کریں گے، فی الوقت یہ عرض کرنا ہے کہ سیاست میں ہم مکمل طور پر معذور ہیں اور پارلیمنٹ مقننہ ہے، اب اگر وہاں اس طرح کا بل پاس ہوتا ہے تو اس کی مخالفت کون کرے گا، عدلیہ کے فیصلوں میں جو شقیں ہوتی ہیں آج تک ہم انہیں اپنے احتجاجات سے نہیں روک سکے، پارلیمنٹ کے ایمنڈ منٹ کے باوجود شاہ بانو کیس کے بعد اب تک اس طرح کے کئی فیصلوں کی شقتیں اس قانون کی دھجی اڑا چکی ہیں لیکن ہم کیا کرسکے، احتجاج، بیانات، جلسے، مظاہرے اور یہی سب ہمارا مقدر بن گیا بس!

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مرتبہ پھر علماء امت سر جوڑ کر بیٹھیں، کیوں کہ قوم کو امید بھی ان ہی سے ہے اور قومی کام وہی کرسکتے ہیں، اپنے ساتھ صالح دانشوروں کو لیں اور ایک بار پھر سے تعلیمی نظام کی تجدید اور سیاسی انقلاب برپا کریں، جب تک ملک گیر سطح پر اور عالمی پیمانہ پر ایسا نظام تعلیم برپا نہیں ہوگا جو اسلامی نظام پر مبنی ہو، جس کے ابتدائی نصاب میں بنیادی اسلامی تعلیم اور انتہاء تک اسلامی فکر شامل نہ ہو تب تک مسئلہ کا حل ممکن نہیں، ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود قوم آج بھی دو خانوں میں تقسیم ہے بلکہ اب تو صورت حال اس سے زیادہ یوں خطرناک ہے کہ مدارس کے فارغین بھی ضرورت کے پیش نظر یا مرعوبیت کے باعث بعد فراغت اسی نظام کا حصہ بنتے جارہے ہیں، کیوں نہ اہل مدارس سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایسا نظام تعلیم اختیار کریں جس میں ثانوی سطح تک تمام علوم کا حسین امتزاج ہو پھر طلبہ کی ذہنی وفکری بنیادوں

پر مختلف شعبہ ہائے تعلیم میں انہیں تقسیم کر دیا جائے، اور یہ سب کچھ مدارس کی روح پرور فضا میں انجام پائے، شاید اس عمل کے بعد جو علماء وحفاظ نکلیں گے وہ مخلص وتبحر اور ملت کے لیے بہت کارگر ہوں گے، اور ساتھ ہی ہر میدان میں ہمیں دیندار افراد کار میسر آسکیں گے، اور جب تک یہ کام نہ ہوگا تب تک میدان عمل میں صرف پیوندکاری ہوتی رہے گی اور ملی وقومی کام کے لیے افراد کار ندارد رہیں گے، بس کوئی مدرسہ کی دھن باندھے گا اور کوئی کالج کا نعرہ لگائے گا، کوئی دین سے ہی منحرف ہوگا اور کوئی منبر ومحراب تک محدود ہوگا، قوم غلامی کی زنجیروں میں سسکتی رہے گی اور مسائل کے انبار میں دبتی چلی جائے گی۔

ٹھیک اسی طرح ضرورت ہے کہ علماء کرام اپنے پورے تشخص کے ساتھ عملی سیاست کی طرف متوجہ ہوں اور ملت کی کامل رہنمائی کا متحد ہوکر فریضہ انجام دیں اور اس امر کو بہر حال پیش نظر رکھیں کہ جب تک مقننہ میں ملی جذبہ سے سرشار، غیرت قومی سے آشنا اور مذہب پسند لوگوں کی خاطر خواہ نمائندگی نہیں ہوتی تب تک ہماری لڑائی محض احتجاجی اور جلسہ وجلوس تک محدود رہے گی بلکہ ہماری بہترین توانائی ان ناکام کوششوں میں صرف ہوتی رہے گی، ہم ہی مہرہ بنیں گے، ہمارے ہی بَل پر حکومتیں قائم ہوں گی، ہماری ہی قوم کے افراد قتل کیے جائیں گے اور ہم ہی کو بازآبادکاری کرنی پڑے گی، ہمیں بازآبادکاری کی ذہنیت سے نجات پاکر آبادکاری کا ذہن بنانا ہوگا، اور یہ سمجھنا پڑے گا کہ اسلام میں یا آزادی کے ساتھ جینے کا تصور ہے یا مرجانے کا، غلامی کی اس میں گنجائش نہیں، ہمیں اپنی کوششوں کو قرآن کے جامع پیغام پر پرکھتے رہنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ کہیں خالق کائنات ورب ذوالجلال ہم سے بھی اسی لب ولہجہ میں نہ مخاطب ہو جس طرح یہود سے مخاطب ہوا، قرآن کا فرمان ہے أفتومنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض فما جزاء من يفعل ذلك منكم الاخزى فى الحيوة الدنيا ويوم القيٰمة يردون الى اشد العذاب وما الله بغافل عما تعملون (بقرہ ۸۵) (تو کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو، ایسا کرنے والوں کی سزا یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں انہیں رسوا وذلیل ہونا ہے اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں گھرنا ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت (قسط-۱۶)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ھے''

کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

تحریر: مسٹر اڈیار ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے محض ایک غلط دعویٰ ہے اور تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے، آیئے، اس پہلو سے بھی حقیقت کا جائزہ لیں اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

عیسائیت اور اسلام اپنے ابتدائی مرحلہ میں خاموش تبلیغ کے ذریعہ سے پھیلائے گئے۔

عیسائیت کی اشاعت حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے حواریوں نے کی۔

مگر اسلام کی تبلیغ کچھ ہی دنوں تک خاموش انداز میں ہوتی رہی، پھر ببانگِ دہل اس کی دعوت دینے کا حکم آ گیا۔

اسلام میں کوئی جبر و اکراہ نہیں، واضح طور پر اس کا اعلان کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا: ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں''، ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو نبیؐ نے جنگیں کیوں کیں اور آپؐ کو تلوار کیوں اٹھانی پڑی؟ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ نے جو جنگیں کی ہیں انہیں جارحانہ جنگ نہیں کہہ سکتے۔ آپؐ کی جنگیں جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ تھیں۔ اہلِ مکہ مدینہ کی اسلامی ریاست کو ختم کر دینے کے منصوبہ سے نکلے تھے، یہ مدینہ وہی ہے جس نے خدا کے نبیؐ کو پناہ دی تھی۔ اسلام کے نظام کو ختم کرنے کے لیے قریش نے جارحانہ اقدام کیا تو ان سے جنگ کرنی پڑی۔

تاریخ کے بعد کے ادوار میں مسلم حکمرانوں نے جو جنگیں لڑی ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہندو راجہ راجندرن نے جاوا اور سماترا پر فوج کشی کی، وہاں آج بھی ہندو کلچر کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ راجہ راجندرن نے ہندو مذہب کے پھیلانے کے لیے یہ فوج کشی کی تھی۔

یورپ کے عیسائیوں نے فوج کشی کی اور مشرقی ممالک میں اپنا سامراج قائم کیا، اس سامراجیت میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان ممالک میں عیسائیت تلوار کے زور سے پھیلی ہے؟ فوج کشی تو بالعموم ملک گیری کے لیے ہوتی ہے پھر جس ملک میں جن لوگوں کی حکومت قائم ہوجاتی ہے ان حکمرانوں کی نقل وہاں کے عوام کرنے لگتے ہیں اور ان کے مذاہب کو اختیار کرنے لگتے ہیں، ہندوؤں کا ایک مسلک سمنر مسلک ہے، اس مسلک کے لوگوں کی حکمرانی جب ٹمل ناڈ میں ہوئی تو یہاں سمنر مسلک کا فروغ ہوا، ہندوستان میں جب بدھ حکمراں تھے تو بدھ ازم کو فروغ حاصل ہوا، اسی طرح سیومر مسلک کے لوگ حکمراں ہوئے تو یہ مسلک مقبولِ عام ہوا، اور جب ویشنو مسلک کے لوگ حکمراں ہوئے تو اس مسلک کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا راجہ ویسی پرجا کی بات ہی تھی ورنہ مذہب کے پھیلاؤ سے ان حکمرانوں کو نہ دلچسپی تھی نہ اس کے لیے حکمرانوں نے کبھی جنگ ہی کی۔

تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ اگر کسی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو اسے محض اسلام قبول نہ کرنے کے جرم میں قتل کر دیا گیا ہو۔

مگر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان کشمکش میں مذہب کی بنیاد پر وسیع پیمانے پر قتل وغارتگیری ہوئی، دور کیوں جایئے، ٹمل ناڈ کی تاریخ دیکھیے، مدورائی میں گیان سمندر کے دور میں آٹھ ہزار سمنر مسلک کے پیروؤں کو مصلوب کیا گیا، یہ ہماری تاریخ ہے۔

عرب میں نبی کریم حکمراں تھے تو وہاں یہودی بھی آباد تھے اور عیسائی بھی لیکن ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے زمانے میں ہندو مذہب کو اپنانے اور اس پر چلنے کی مکمل اجازت تھی، تاریخ شاہد ہے کہ کہ ان حکمرانوں نے مندروں کی حفاظت کی ہے، ان کی نگرانی کی ہے۔

مسلم فوج کشی اگر اسلام کو پھیلانے کے لیے ہوتی تو دہلی کے مسلم سلطان کے خلاف مسلمان بابر ہرگز فوج کشی نہ کرتا۔ ملک گیری اس دور کی مسلمہ سیاسی پالیسی تھی۔ ملک گیری کا کوئی تعلق مذہب کی اشاعت سے نہیں ہوتا۔ بہت سارے مسلم علماء وصوفیاء اسلام کی تبلیغ کے لیے ہندوستان آئے ہیں اور انہوں نے اپنے طور پر اسلام کی تبلیغ کا کام یہاں انجام دیا۔ ان کا مسلم حکمرانوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے ثبوت میں ناگور میں مدفون حضرت شاہ الحمید اور اجمیر کے شاہ معین الدین چشتی وغیرہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسلام اپنے اصولوں اور اپنی اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اپنے اندر بے انتہاء کشش رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے قلوب اس کی طرف خود بخود کھنچتے چلے آتے ہیں۔ پھر ایک ایسے دین کو اپنی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانے کی حاجت ہی کیا باقی رہتی ہے۔

کمیونزم سے بہتر اور برتر ہے اسلام

سرمایہ داری کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑنے والے نظریات دو ہیں، ایک کمیونزم دوسرا اسلام۔

یہاں کے کمیونسٹوں میں چند ہی نے داس کیپٹل (Dascapttal) کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا، مراکس کی ایک تھیوری ہے جس کا نام ہے قدر زائد (Serplousvalue) اسی اصول کی وضاحت پر مارکس کی تحریر تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

کمیونزم کا دعویٰ ہے کہ سرمایہ کار اپنا سرمایہ لگاتا ہے۔ مزدور اپنی محنت سے اس سرمایہ میں نفع پیدا کرتا ہے۔ یہ جو منافع ہے جو اصل سرمایہ سے زائد ہوتا ہے اس زائد آمدنی سے سرمایہ دار ایک اور کارخانہ کی بنیاد ڈالتا ہے اور عوام کا استحصال کرتا ہے۔ اس دعویٰ کے بعد کمیونزم آگے بڑھتا ہے اور سرمایہ داری کی اصل قوت یعنی اس قدر زائد کو ختم کرنے کا عزم کرتا ہے۔ وہ سرمایہ داری کو مٹا کر پیداوار کے سارے ذرائع کو قومیا لیتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ صنعتوں کو قومیا لینا کیا مسئلہ کا حل ہو سکتا ہے؟ قومیائی ہوئی صنعت میں بھی قدرِ زائد یا نفع وجود میں آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ اس نفع کو کہاں لے جاتا جائے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آج عملاً اس نفع کا کیا ہو رہا ہے۔

پہلے صنعتوں کو قومیایا جاتا ہے۔ پیدا ہونے والے نفع سے مزدوروں کو کچھ حصہ دیا جاتا ہے باقی عوام کے لیے کچھ بھی نہیں۔

کسی صنعت کے نفع میں سے صرف اس میں کام کرنے والے مزدوروں ہی کو حصہ ملتا ہے دیگر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں یا ملک کے غریب عوام کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ قومیا لیے جانے کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نفع قوم کے سارے افراد پر تقسیم ہونا چاہیے۔

کمیونسٹ حکومت قانون کے زور سے نفع چھین کر دوسروں کو دیدیتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں قدرِ زائد کو دوسروں پر خرچ کرنے پر ابھارا جاتا ہے اور اس کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس عمل کے پیچھے اصل محرک حکومت کا دباؤ نہیں بلکہ عقیدہ کی طاقت ہوتی ہے۔

☆☆☆ (.....**جاری**)

تجزیہ

امت مسلمہ کا فکری بحران

تحریر: پروفیسر محمد الغزالی (پاکستان)
ترجمہ: شان محمد ندوی

قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کو دو طریقوں سے بیان کیا جاسکتا ہے، (۱) انسانی تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات یا حادثات کی عقلی وجہ تلاش کرنا، سوچنے کا یہ انداز اس خیال کی بنا پر ہوتا ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کو عقلی بنیادوں پر سمجھا جاسکتا ہے اور تاریخی واقعات کا عقلی تجزیہ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے قوموں، تہذیبوں اور معاشروں کے عروج وزوال کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخی واقعات کا اس طرح تجزیہ کرنے والے تاریخ کو ایک ایسا بامقصد انسانی عمل سمجھتے ہیں، جس کے اپنے اصول ہیں اور جو مرتب ومنظم ہونے کے ساتھ امکانی طور پر مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہے، یہ وہ موجودہ عالمگیر خیالات ہیں جنہوں نے ان میدانوں میں مغرب کے دعووں کو عقلی جواز فراہم کیا ہے۔

اس کے برعکس اسلامی نقطہ نظر انسانی خواہشات کو خدا کی مرضی کے تابع کرتا ہے اور خدا کی طرف سے دی ہوئی آزادی کو بیان کرنے کے ساتھ افراد اور معاشرے کی اخلاقی ذمہ داریوں پر زور دیتا ہے، اور انسانی معاشرے کی ہر کامیابی و ناکامی کو اخلاقی اصولوں کی پیروی اور ان سے انحراف کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بحران کی وجہ ان لوگوں کا اخلاقی اصولوں سے انحراف ہے جو امت مسلمہ کے قائد اور میر کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں، استعمار کے خاتمہ کے بعد امت مسلمہ کے قائدین نے امت کو اپنی ترجیحات میں شامل نہیں کیا، وہ اسلام کے مدعی تو ضرور ہیں لیکن امت اسلامیہ کے سلسلہ میں اپنا کردار واضح اور متعین نہیں کرتے، انہوں نے امت کے خوابوں، اس کی فکروں اور اس کی پریشانیوں سے اپنا ناطہ توڑ لیا جس کا نتیجہ واضح طور پر پورے انسانی معاشرہ پر پڑ رہا ہے۔

آج تک ہمارے قائدین کی امیدوں، تمناؤں اور جذبۂ اطاعت کا محور غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی ہے، ایسے لوگوں کو قائد بنانے کے سلسلہ میں عوام اور افراد کو یکسر بری الذمہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جہاں قرآن ظالم حاکموں کی مذمت کرتا ہے وہیں ان لوگوں کی بھی مذمت کرتا ہے جو ان کی دھن پر ناچتے ہیں اور ان لوگوں پر سخت تنقید کرتا ہے جو ظالمانہ حکومت کے قیام کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی رضامندی اور تعاون کے بغیر کوئی بھی ظالم و مطلق العنان حکمراں اپنے آپ کو تاریخ میں باقی نہیں رکھ سکتا، یہ بات بجا ہے کہ اس سلسلہ میں بیشتر ذمہ داری قائدین اور خاص طور پر حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے لیکن عوام کو پوری طرح ان کاموں سے سبکدوش نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ چونکہ قائدین عوام کی

قیادت کررہے ہوتے ہیں اس لیے فرمانِ رسول کے مطابق ان پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مسلم قائدین خاص طور سے وہ لوگ جنہیں اقتدار بھی حاصل ہے وہ امت کے قائد کی حیثیت سے اخلاقی ذمہ داری انجام دینے سے منحرف ہو چکے ہیں، اس وقت امت کی تمام خرابیوں کی وجہ قائدین کا اپنی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں غفلت برتنا ہے۔

جب کوئی شخص ایک قابل قدر ملازمت اور عہدہ و منصب پر ہوتے ہوئے اس ملازمت کے حقوق اور ذمہ داریوں کو ادا نہیں کرتا تو وہ اس شرعی اور اخلاقی جرم کی بہت ساری عقلی توجیہات پیش کررہا ہوتا ہے، عقلی اور علمی طور پر کوئی چیز ایسے شخص کو ذمہ دار اور کام کا پابند نہیں بنا سکتی۔ لیکن اگر ایک شخص اللہ کے تئیں اپنے عہد کا پابند ہے اور ایمانداری کے ساتھ اپنے آفس کی ذمہ داری انجام دیتا ہے تو اس کی عقلیت اس اللہ کی رہنمائی میں کام کرتی ہے جو عقل اور علم کا دینے والا ہے، ہمارا ماننا ہے کہ اخلاقی زوال مسلمانوں کے فکری زوال سے پہلے شروع ہوا اور مسلمانوں کی موجودہ ابتر اور ناگوار صورتحال اسی اخلاقی زوال کی وجہ سے ہے۔

آج مسلمانوں کی سب سے تکلیف دہ بیماری اور کمزوری وہ بڑھی ہوئی احساس کمتری ہے جس میں ان کے قائدین مبتلا ہیں، موجودہ قیادت کم وبیش عہد استعمار کی بقایا ہے، مسلم دنیا کے بڑے حصے میں استعماری مداخلت تاریخ کے قدرتی پیش رفت میں حائل ہوئی، حتی کہ وہ بعض علاقے اور آبادیاں جو نوآبادیاتی کنٹرول سے محفوظ رہیں وہ بھی پورے طور پر استعمار کے استحصال سے محفوظ نہ رہ سکیں، اس زمانہ میں کچھ ایسی صورتحال پیدا ہوگئی کہ غیر ملکی طاقتوں کے تئیں مشرقی قوموں کا ردعمل ان کی قیادت کی تعیین میں اہم کردار ادا کرنے لگا، بعض قوموں اور ملکوں نے ان بیرونی طاقتوں کے ساتھ مخالفت کی روش اپنائی اور بعض ان کے حلیف بن گئے، دیکھا جائے تو دونوں ہی فریقوں کا طرز عمل کسی تجزیہ یا غیر ملکیوں کی کسی خامی یا خوبی کی بنیاد پر نہیں تھا۔ آج بھی مسلم قیادت ذہنی طور پر اس عہد استعمار کی غلامانہ ذہنیت کی اسیر ہے۔

جن مختلف مسائل سے امت دوچار ہے کبھی اسے سیاسی وجوہات سے منسوب کر دیا جاتا ہے، کچھ لوگ اس کا منبع سیاسی اصلاحات کی کمی بتاتے ہیں، تو کچھ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلم ممالک میں قدرتی اور انسانی وسائل کا صحیح استعمال نہیں ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں GNP اور GDP میں گراوٹ ہوتی ہے اور فوائد نامناسب اور غیر مستحق لوگوں کو مل جاتے ہیں، کچھ لوگ پوری خرابی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تجرباتی سائنس کے میدان میں مسلمانوں نے تحقیق کی اس رفتار کو برقرار نہیں رکھا جس پر وہ کبھی قائم تھے اور اس سلسلہ میں صارفین کے بازار میں اپنی ایجادات و اختراعات کے ذریعہ وہ اپنا وجود ثابت نہ کر سکے، وہ لوگ جنہیں عام طور پر قدامت پسند سمجھا جاتا ہے انہوں نے اس پورے بحران کی اصل وجہ اسلام سے دوری قرار دیا۔

امت کے بحران کا مختلف انداز میں تجزیہ کرنے والے ان سبھی لوگوں نے ہماری بیماری کی وجہ کی صحیح تشخیص کی ہے، لیکن یہ سب متعین طور پر یہ بتانے میں ناکام رہے ہیں کہ واقعی exactly صحیح راستے سے وہ کون سا انحراف ہے جس نے ہمیں اس خطرناک ناگوار صورت حال تک پہنچا دیا ہے، مختلف خیالات رکھنے والے لوگ اس بات کے لئے آزاد ہیں کہ وہ اس انحراف کی جس طرح چاہیں تشریح کریں، اور اس کے مطابق اس کا حل پیش کریں، ان کی تشریحات ہوسکتا ہے کہ جزئی طور پر اور خاص سیاق میں صحیح بھی ہوں، لیکن بہرحال ہماری ٹوٹی پھوٹی رائے کے مطابق بنیادی سبب قائدین کا اخلاقی انحطاط ہے، ایسا لگتا ہے کہ شدید احساس کمتری جس میں قائدین مبتلا ہیں وہ امت کے اخلاقی

انحراف کی قدرتی سزا ہے، اس خطرناک احساس کمتری کا سبب مسلم قائدین کا وہ ذہنی سانچہ ہے جو استعمار کے زمانہ میں مختلف حالات کے تحت تشکیل پایا ہے، یہ احساس کمتری جہاں انہیں ماضی پر فخر سے روکتا ہے، وہیں حال میں پر اعتماد رہنے اور مستقبل کے سلسلہ میں پر امید ہونے سے بھی روکتا ہے۔

جب استعمار کے شدید حملہ کے بعد مسلمانوں کی مہم جوئی کو اس کے تاریخی سفر سے روک دیا گیا تو استعماری طاقتوں کے تئیں مسلمانوں کا ردعمل خاص طور پر دو پہلو لیے ہوا تھا، (۱) استعماری طاقتوں کا بے انتہا خوف (۲) بزدلی کے ساتھ ان کے اقتدار کو تسلیم کرنا۔ جن مسلمانوں کو استعمار کا سامنا تھا انہیں ایسا لگا کہ استعماری طاقتیں تصور وادراک کی غیر معمولی موروثی صلاحیت کی وجہ سے مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے حاوی ہوگئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو مغربی اقوام کے تسلط کو اپنی قسمت کا حصہ ہی سمجھ لیا اور مزاحمت کے بجائے خود سپردگی کو ترجیح دی، انہوں نے اپنی فکر اپنے رویے حتی کہ اپنی تمناؤں، خواہشات، اخلاقی و جمالیاتی ذوق اور اپنی روح غرض یہ کہ ہر چیز کو استعماری منصوبہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف بعض لوگوں نے غیر ملکی طاقتوں سے بے اعتنائی کو کافی سمجھا اور ان سے علیحدہ رہنے کی کوشش کی، اور اپنے آپ کو اس خول میں بند اور اس جزیرہ میں محصور کرلیا جو انہوں نے خود اپنے لیے بنایا تھا۔

دونوں ہی جماعتوں کا ردعمل ہزیمت پسندی اور غیر ملکی طاقتوں سے نامناسب خوف پر مبنی تھا، اسی کا تسلسل استعمار کے خاتمہ کے بعد بھی آج ہم محسوس کرسکتے ہیں۔

ایک تیسرا طبقہ وہ بھی تھا جس نے قومی روایات کے تقاضوں اور نئی حکومت کے مطالبات کے درمیان تطبیق کی کوشش کی، لیکن بہرحال یہ طبقہ اپنی خوبیوں کے باوجود نئی تبدیلیوں کا گہرائی سے تنقیدی تجزیہ کرنے میں ناکام رہا، اور نتیجۃً نئے علم و تجربات کو اسلام کے اخلاقی معیار اور ثقافتی ترجیحات سے ہم آہنگ نہ کر سکا، اس طبقہ نے مغربی فلسفیانہ خیالات کو چیلنج کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی اور مغربی واجنبی خیالات کو اسلام کے ثقافتی دھارے میں شامل کرنے کی کوشش کی، اس وجہ سے یہ طبقہ کوئی غیر معمولی اثر نہیں ڈال سکا۔

بہرحال یہ سب طریقے دفاعی تھے اور ردعمل کا انداز لئے ہوئے تھے، جب علانیہ استعمار کا دور ختم ہوا تو اس امت کے قائدین نے اس سلسلہ میں کوئی خاص کوشش نہیں کی کہ اپنی ثقافت کے خوابیدہ عناصر کو پھر سے منظر عام پر لایا جائے اور اس امت کی ترقی کے تاریخی تسلسل کو پھر سے بحال کیا جائے، وہ استعماری اسیری کے صدمہ سے سنبھل نہ سکے۔ بالکل اس طرح جیسے طویل عرصہ سے پنجرہ میں قید ایک چڑیا آزاد کئے جانے کے بعد بھی پرواز پر قادر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ ہمارے قائدین اب بھی وقار اور طاقت کا مرکز پیرس، لندن اور ایمسٹرڈم کو سمجھتے ہیں جنھیں استعمار کے رمز کی حیثیت سے جانا جاتا رہا ہے، وسطی ایشیائی قیادت نے اپنی آزادی کے بعد روسی فیڈریشن کے تئیں جو رویہ اپنایا وہ بھی بالکل اسی قسم کا طرز عمل ہے جو سابق کالونیوں کے ملکی رہنماؤں نے اپنے استعماری آقاؤں کے تئیں اختیار کیا تھا۔

مختصر یہ کہ ہمارے قائدین ہماری حقیقی بنیادوں کی بازیافت اور ہماری مخصوص اقدار کے احیاء میں ناکام رہے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم فکری ناکامی سمجھتے ہیں وہ بنیادی طور پر ایک اخلاقی ناکامی ہے، اور جسے ہم فکری ناکامی کہتے ہیں وہ خود اسی اخلاقی ناکامی کا نتیجہ ہے، چونکہ اسلامی تعلیم کے مطابق دل ہی وہ مرکز ہے جس کا اخلاقی انتخاب اور رویہ ہمارے فکری رخ کو متعین

کرتا ہے۔ ہم جس مقام ومرتبہ پر تھے اسے پھر سے ہم پا سکتے تھے اگر ہماری قیادت ہمارے زوال کی اصل وجہ کا ادراک کر لیتی، ہمارے ماضی کی طرف ہماری واپسی اور اپنی اصل شناخت کو پھر سے بحال کرنے کے لئے ہمیں اپنے گذشتہ تعلیمی طریقوں کو پھر سے تازہ کرنے کی ضرورت تھی، نوآبادیاتی نظام تعلیم کو مسترد کرنے اور اپنی ضروریات کے مطابق ایک نظام تعلیم مرتب کرنے سے یہ ضرورت پوری ہوسکتی تھی، تاہم اس کے بجائے دو مختلف الجہات متوازی نظام تعلیم وجود میں آ گئے ایک مذہبی اور دوسرا لادینی، اور ان کے درمیان ایک دوسرے تک اپنے خیالات کی ترسیل کا کوئی ذریعہ بھی نہیں رہا، دونوں متوازی دھاروں نے مختلف اور اکثر مخالف سمتوں میں اپنا بہاؤ جاری رکھا اور بالترتیب دونوں نے صرف علماء یا کلرک تیار کرنے تک اپنے آپ کو محدود کر لیا، صحیح معنوں میں تعلیم کا ایک اسلامی نظام تیار کرنے کے بجائے ہمارے قائدین نے ایسے Sociopolitical ادارے قائم کرنے کی کوشش کی جو نوآبادیاتی نظام کے مزاج کے مطابق تھے، ہمارے حکمرانوں نے نوآبادیاتی غاصبوں کے چھوڑے ہوتے جوتے پہننے میں فخر محسوس کیا، مجموعی طور پر ہماری قیادت پرانے نظام کو اس کے تمام ابعاد کے ساتھ واپس نہیں لاسکی، ہماری نظریاتی قیادت یہ سمجھنے میں ناکام رہی کہ امت مسلمہ کی اصل حیثیت یہ ہے کہ یہ امت پوری انسانیت کے لیے امن، انصاف، اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی نقیب ہے، اس حیثیت کو تسلیم کرنے اور اس کی بازیافت کے لیے کوشش کے بجائے انہوں نے یہ گوارا کر لیا کہ امت اپنی معمولی اور محدود قومی شناخت کے ساتھ عالمی صورتحال میں اپنا وجود برقرار رکھے، ہماری قیادت قرآن کی اس دعوت پر توجہ دینے میں ناکام رہی جس میں اس نے اپنے متبعین کو آخری کتاب ہدایت میں نازل کردہ حقائق کا شاہد وامین بنایا تھا، اور اسی بنیاد پر قرآن نے امت مسلمہ کو خیر امت کا خطاب دیا تھا، جسے لوگوں کی نفع رسانی کے لیے برپا کیا گیا، اس کے برعکس ہماری قیادت استعمار سے پیدا شدہ صورت حال کے ہاتھوں یرغمال بنی رہی، نیز مسلم ممالک کے حکمرانوں کے تئیں مختلف مذہبی جماعتوں کی مسلسل دشمنی نے بھی مسلم حکمرانوں کی ذہنیت کی تشکیل میں کردار ادا کیا۔

یہ اللہ کا ہمیشہ احسان رہا ہے کہ جن افراد اور جماعتوں نے اللہ کے حکم کے مطابق لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنے اور برائی سے روکنے کا فریضہ انجام دیا وہ ہمیشہ سرخرو رہے اور اس دنیا میں عزت ومرتبہ کے اعلیٰ مقام پر رہے، جب مسلمانوں نے اس اہم ترین فریضہ کو ترک کر دیا تو وہ اس وقار اور عزت سے محروم ہوگئے، سچی بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے جانشین کی حیثیت سے اس امت پر جو دعوتی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے غفلت ہی اس امت کے تمام بحرانوں کا بنیادی سبب ہے۔

مسلمانوں کو درپیش خوف کی موجودہ صورتحال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے قائدین اپنے فریضہ منصبی سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ تاریخ میں اپنا اصل مقام حاصل نہ کر سکے۔ ہمارے رہنما دانستہ یا نادانستہ اس منصب سے دستبردار ہوگئے، جو منصب اس امت کو قرآن نے عطا کیا تھا، یہ منصب اس بات پر مبنی تھا کہ یہ امت اسلام کے اس حیات آفرین پیغام کی علمبردار بن کر رہے گی جو درحقیقت پوری انسانیت کے لیے امید اور کامیابی کا پیغام ہے۔

یہ ہماری بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ ہم انسانیت کو سلامتی کے گھر یعنی اسلام کی طرف دعوت دیں، یہ ذمہ داری کسی بھی صورت میں معطل نہیں ہوسکتی، اسلام ہی انسانیت کو ہر غلامی سے نکال سکتا ہے چاہے وہ غلامی خود ساختہ ہو یا کسی کی طرف سے مسلط کر دی گئی ہو۔ اسلام ہی حقیقی آزادی، عزت و وقار، دنیا کی کامیابی اور

آخرت کی نجات کا ضامن ہے، آزادی کے اس منشور کے منطقی نتیجہ کے طور پر اسلام انسانیت کو اچھے اخلاق اور پاکیزہ زندگی کا ایسا پروگرام عطا کرتا ہے جس سے تعصب، ناانصافی، فخر ومباہات، استحصال اور ایک دوسرے پر برتری کی تمام خود ساختہ شکلیں اپنا وجود کھوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسلام تمام مردوں اور تمام عورتوں کو اس عظیم ہستی سے محبت اور عبودیت کا تعلق عطا کرتا ہے جو سب کا خالق، مالک اور پالن ہار ہے، یہ تعلق انسانوں کو ہر قسم کی غلامی کے طوق سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے۔

اب ہر چیز سے پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم بیدار ہوں اور اپنے ذہنوں میں اس منصب وحیثیت کو پھر سے تازہ کریں جو قرآن نے اس امت کو عطا کیا ہے۔

قرآن کا یہ زوردار اعلان "كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" اور اس سلسلہ میں قرآن کے دوسرے توضیحی بیانات واضح طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اس امت کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیتے ہیں جو اس امت کو آخری نبی کی امت کی حیثیت سے سپرد کی گئی ہے۔

مسلمانوں نے تاریخ کے ان لمحات میں بھی جب وہ کمزور تھے ایک باوقار اور باعزت قوم کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھا اس لیے کہ انہوں نے بنی نوع انسانی کے لئے برپا گئی امت کی حیثیت سے اپنا مشن پورا کیا، اسی وجہ سے اسلام کسی قسم کی زبردستی کے بغیر صرف محبت کے ذریعہ بہت ہی مختصر وقت میں پھیل گیا، ماضی کی تاریخ کے تمام ادوار میں مسلمانوں نے اعلیٰ اخلاقی معیار برقرار رکھا اس اور وقت تک خیر امت کے انعامات سے بہرہ ور ہوتے رہے جب تک وہ اپنے بنیادی فریضہ اور پیشے کو ذہن میں رکھ کر اسکے تقاضوں کو پورا کرتے رہے، اس عظیم اجتماعی ذمہ داری کے شعور نے انہیں انسانیت کے تئیں اخلاص اور ایثار پسندی کا پابند نیز مختلف انسانی گروہوں کے ساتھ خوشگوار رابطہ اور دوستانہ ڈائیلاگ قائم رکھنے کے لئے کوشاں رکھا۔

مسلمان دنیا میں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک انسانیت کے ساتھ اپنے تعلقات میں وہ دوسروں کے بنائے ہوئے اصول وضوابط کے یرغمال رہیں گے، اس ذہنی کیفیت نے مسلمانوں کو دوسرے تمام انسانوں کے تئیں خوف، دشمنی اور شکوک وشبہات کے نہ ختم ہونے والے دائرہ میں محصور کر دیا ہے۔ اس خوف اور دشمنی کا اولین نقصان یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں اور خاتم النبیینؐ کے مخاطب پوری انسانیت کے درمیان ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دیں جنہیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔

اس ذہنیت کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ہم نے اس دنیا اور یہاں کے رہنے والوں کے تئیں موجودہ مغربی طرز فکر سے سوچنا شروع کیا، مغرب اس دنیا اور انسانیت کو بالکلیہ ڈارون کے نظریہ سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، مغرب انسانوں کے درمیان دائمی اختلاف اور مسابقہ آرائی کو انسانی وجود کی ایک فطری حالت تصور کرتا ہے، اس معاملہ میں وہ انسانوں کو تقریباً عام جانوروں کے مماثل سمجھتا ہے، Survival of the fittest کے اس بے بنیاد اصول وکلیہ کے تحت اس دنیا اور اس میں رہنے والے تمام نفوس (انسانی وحیوانی) کو باہمی تنازعہ کی ایک مسلسل حالت میں رہنا ضروری ہے، اس اصول کے مطابق اس دنیا میں صرف Fittest ہی جی سکتا ہے۔ باقی سب فنا ہونے کے لئے ہیں، تاہم اس نظریہ کے مطابق انسانوں نے اپنے باہمی مفادات کی حفاظت کے لئے ایک نام نہاد سماجی معاہدہ پر اتفاق کر لیا ہے، اس فرضی معاہدہ کی شرائط کے تحت لوگ اپنے موروثی اختیارات کا ایک حصہ ریاست کی اجتماعی ایجنسی یعنی حکومت کو سپرد کرنے پر

رضامند ہوگئے ہیں تا کہ ان کی طرف سے وہ اختیارات استعمال کر سکے، ورنہ خود مختار افراد کے متصادم مفادات ایسی بدنظمی اور انتشار کا باعث ہوں گے جس کا نقصان سب کو اٹھانا پڑے گا، سماجی معاہدہ کا یہ مذکورہ افسانہ ایک قومی ریاست کے تنگ فریم ورک تک محدود ہے، ورنہ اسی ڈارونی نظریہ کے تحت مختلف ریاستیں آپس میں سخت دشمنی کا تعلق رکھتی ہیں، اس سلسلہ میں اگر کوئی استثناء ہے تو وہ بھی قومی مفادات کے تحفظ کے لئے ہے، یہ نظریہ پورے طور پر اس تصور پر ٹکا ہوا ہے کہ ہر سطح پر انسانی تاریخ میں باہمی تنازعہ ضروری اور فطری ہے، اس تصور کے بعد اگر کوئی عارضی صلح کی بھی جاتی ہے تو وہ صرف اس وقت جب کہ اس کے بغیر ذاتی ملی اور قومی مفادات کا حصول ممکن نہ ہو۔

اس تصور کے برعکس اسلام انسانوں کے سلسلہ میں ایک مثبت نقطۂ نظر رکھتا ہے، اور پہلے سے موجود کسی اخلاقی قصور وگناہ سے ان کو آزاد تصور کرتا ہے، وہ انسان کو اللہ کی سب سے اشرف مخلوق سمجھتا ہے جسے بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا اور جس کی فطرت کا خمیر ہی خدا شناسی پر اٹھا، اسلام میں ہر فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت زمین میں خلیفۃ اللہ تسلیم کیا گیا ہے جس میں اللہ نے ایثار کی صفت رکھی ہے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ دوسرے انسانوں کے تعاون کا جذبہ ودیعت کیا ہے، اسی طرح اسلام انسانوں کے متعلق Conflictual نوعیت کے مغربی ڈارونی نظریہ کو مسترد کرتا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے انسانوں کے مابین امن، ہم آہنگی اور باہمی تعاون زندگی کی اصل حالت ہیں، تنازعہ اور انتشار مستثنیات ہیں، جبکہ مغربی نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔

مسلم قیادت مغرب کے اسلام مخالف نظریات کے دام فریب میں آچکی ہے، مسلم قائدین اگر اپنے آپ کو مغرب کی بے پناہ برتری کے احساس سے نجات دلاسکیں اور حقیقت کا اسلامی نقطۂ نظر سے ادراک کرسکیں تو ضرور وہ اس مغربی تسلط کو بے اثر کرنے پر قادر ہوجائیں گے جس نے انہیں غیر فعال اور اپنی اولین ذمہ داری انجام دینے سے قاصر و بے بس کر رکھا ہے، اس کے علاوہ دوسری وہ تمام کوششیں جو مغربی پیراڈائم کے اندر ہوں گی ان سے صرف مغربی سامراجی ایجنڈے کو فروغ ملے گا۔

ہمارے قائدین جنہوں نے غیر تنقیدی انداز میں تصادم کے نظریہ کی تائید کی ان میں جدت پسندوں کے ساتھ وہ طبقہ بھی شامل ہے جسے قدامت پسند سمجھا جاتا ہے تاہم دونوں ہی اس سلسلہ میں اسلام کے اصل وژن سے بہت دور چلے گئے ہیں، کچھ لوگوں کو شاید یہ شبہ ہو کہ ہم امت کی بے غرض دعوت پر زور دیتے ہوئے شریعت کے بنیادی ڈھانچہ سے جہاد کے نظریہ کو نکال رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں، اس لئے کہ جہاد شریعت کا ایک لازمی حصہ ہے، البتہ اس کا تعلق شریعت کے مکمل وژن سے ہے اور اس پر عمل درآمد کے لئے واضح شرائط اور قانونی تقاضوں کی تکمیل ضروری ہے، پھر یہ کہ جہاد کا مقصد انسانوں کا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنا اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اس امت کو تفویض بنیادی فریضہ (انسان کو سچائی امن اور انصاف کی دعوت دینا) کی ادائیگی میں سہولت فراہم کرنا ہے، بالفاظ دیگر جہاد کا مقصد امت کے حق تبلیغ کا دفاع ہے جس میں طاقت سمیت تمام ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں تا کہ امت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے سکے، نیز اللہ کے رسول ﷺ کی جانشین امت کی حیثیت سے انسانیت کو اسلام کی طرف بلانے، انصاف کو فروغ دینے اور ہر قسم کے جبر کی مخالفت کا کام بحسن وخوبی انجام دے سکے، اس بنیادی اور حتمی مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ ایک مسلمان اس

مشترکہ رہائش گاہ یعنی دنیا کو امن، باہمی مفاہمت، انصاف، اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مرکز بنانے کے مشترکہ اہداف کے حصول میں غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے آزاد ہے، تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ دعوت اور جہاد کے نتیجہ میں بڑے پیمانے پر نئی اقوام نے اسلام کے دامن میں رضا کارانہ پناہ لی ہے، اسلام قبول کرنے والے ان لوگوں نے بہت جلد امت کی زمام قیادت سنبھال لی، اور اصل مبلغین خوشی خوشی ان کے پیروکاروں میں شامل ہوگئے، اس طرح امت کی قیادت مختلف تاریخی ادوار میں الگ الگ قوموں کے ہاتھوں میں رہی اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تک امت کی قیادت ہمیشہ عربوں کے یہاں محصور رہتی۔

اس وقت مروجہ نظام تعلیم کی وجہ سے ہماری قیادت کا نقطۂ نظر مکمل طور پر غیر اسلامی خیالات کے زیر اثر ہو چکا ہے، مغربی ممالک ہمارے معاملات میں جس طرح مداخلت کرتے ہیں اس پر بجائے اس کے کہ ہماری قیادت کوئی مناسب ردعمل دکھاتی وہ سابق استعماری طاقتوں اور ان کے اتحادیوں کے ہاتھوں میں یرغمال بنی ہوئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قائدین کو اپنے اندرون میں جھانکنے اور یہ غور کرنے کا وقت نہیں ملتا کہ کس صورتحال اور کن اسباب کی بناء پر ہم اپنے سیدھے راستے سے کس وقت ہٹ گئے، سچ تو یہ ہے کہ اس وقت شاید ہی مسلم دنیا میں کوئی سیاسی لیڈر ایسا ہوگا جو موجودہ صورتحال پر اس انداز سے سوچتا ہو، وہ زندگی میں پیش آنے والی ہر کامیابی یا ناکامی کو مغرب سے دوستی یا دشمنی سے مربوط کرتے ہیں، اس رویہ کی بناء پر ہمارے قائدین نے اپنے آپ کو اقتدار و طاقت کے مغربی کھیل کے تابع کرلیا ہے۔

انہوں نے بسا اوقات اقتدار کے اس کھیل میں پھر گھسنا چاہا جس میں وہ نام نہاد سپر طاقتوں کے ماتحت رہنے کے لئے بڑی چالاکی سے پھنسا دیئے گئے ہیں، اس طرح کی کوششوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اس امت کو دی گئی ذمہ داریوں اور ہمارے قائدین کے درمیان فاصلہ کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

ہم یہاں کسی قسم کے فرار کی تجویز نہیں پیش کر رہے ہیں، نہ ہی ہم ان طاقتوں کو شہہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، ہم صرف اس بات پر زور دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی کچھ اجتماعی ذمہ داریاں ہیں جن کے مقابلہ میں جنگ، امن، مسلمانوں کا وجود اور اس طرح کے دوسرے تمام مسائل کوئی وقعت نہیں رکھتے، قرآن کے فیصلہ کے مطابق امت کی بنیادی ذمہ داری اسلام کی سچائی کی شہادت دینا ہے، اس مشن کو پورا کرنے کے لئے قرآن ہمیں زندگی کا ایک تفصیلی پروگرام عطا کرتا ہے۔

اس مشن کو پورا کرنے میں امت کو جن چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، ان سے نپٹنے کے لئے قرآن نے ہدایات بھی فراہم کی ہیں، یہی مشن تاریخ کے اسٹیج پر مسلمانوں کے وجود کا بنیادی سبب ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے تفصیل کے ساتھ بار بار اعادہ کر کے بیان کیا ہے، لیکن ہم تقریبا پورے طور پر یہ بھول چکے ہیں کہ اس شاندار اور پر حکمت کتاب سے کیسی زبردست توانائی، باطنی قوت اور دقیق و عمیق حکمتیں ہمیں دستیاب ہو سکتی ہیں، قرآن آج بھی ہمیں وہ عظیم الشان قوت فراہم کر سکتا ہے جو اس نے ہمارے اسلاف کو فراہم کی تھی جب وہ اس مشن کے تئیں وفادار تھے۔

اس مشن کا اولین مطالبہ اور تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اللہ کی کتاب میں بتائے گئے طرز پر

ڈھالنے کی فکر کریں، اس لئے کہ یہ حق کی گواہی دینے کی راہ کا لازمی عنصر ہے جو گواہی مسلمانوں کو ہر زمانہ اور ہر حالت میں دینی ہے، اپنی زندگی کو اللہ کی کتاب کے مطابق کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا عام طور پر مسلمانوں کا طرز عمل دیکھ کر اسلام کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ کرتی ہے، ایک مثالی قرآنی زندگی مسلمان اس وقت جی سکتے ہیں جب انہیں ایسی اسلامی زندگی گزارنے کی تربیت دی جائے جو ہر طرح کی ہچکچاہٹ اور احساس کمتری سے پاک ہو اس طرح ہو اسلامی زندگی کا ایک زندہ نمونہ اور جیتی جاگتی مثال پیش کر سکیں گے، اسوۂ نبوی کے تناظر میں اسلام پر عمل کرنا اس کی دعوت دینے کا سب سے اچھا طریقہ ہے، اسلامی تربیت کا نقطۂ عروج وہ صلاحیت حاصل کرنا ہے جس کے ذریعہ ہم پوری انسانیت کو سلامتی کے گھر کی دعوت دے سکیں، یہ بات ہمیں اپنے موجودہ رویہ، افکار اور کردار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دیتی ہے نیز پوری انسانیت کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک Common lexicon تیار کرنے کی کی دعوت دیتی ہے، یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ پوری انسانیت اللہ کے رسول ﷺ کی ممکنہ (بالقوۃ) امت ہے۔

یہ بھی ذہن میں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بہت سی مضبوط شیطانی طاقتیں مستقل طور پر مسلمانوں کو دنیا کے دوسرے لوگوں کے ساتھ حقیقی یا فرضی جنگوں میں الجھائے رکھنا چاہتی ہیں تاکہ مسلمانوں اور انسانیت کے درمیان خوشگوار بات چیت کے راستے مسدود رہیں، آپ محسوس کریں گے کہ جب کبھی امن کا کوئی دور گزرتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب دنیا اسلام کے پیغام کو سن رہی ہوگی اچانک مسلمانوں اور بقیہ پوری انسانیت کے درمیان دراڑ پیدا کرنے کے لئے خفیہ طاقتوں کی طرف سے مصنوعی طور پر کوئی بحران پیدا کر دیا جاتا ہے۔

جب تک مسلمان قائدین سنجیدہ طور پر قرآن کی طرف رجوع نہیں کریں گے، اپنے ماضی قریب کا جائزہ نہیں لیں گے اور زندگی میں پھر سے اپنا کردار اور حیثیت متعین کرنے کے لئے قرآن سے حقیقی رہنمائی حاصل کرنے کے آرزومند نہیں ہوں گے، اس وقت تک وہ ایک طوفان کے بعد دوسرے طوفان بلا خیز کا شکار ہوتے رہیں گے، وہ کبھی امن وسلامتی کے اس ساحل پر نہیں پہنچ سکیں گے جہاں وہ بھی امن سے ہوں اور دوسرے بھی امن سے ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو بہت سی اقوام کو اعلی درجہ کی بلندیوں سے ہم کنار کرتی ہے اور بہت سی اقوام کو ذلت کی انتہا تک پہنچاتی ہے جب وہ اس سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیتے ہیں، اس فیصلہ کن لحہ میں ہمیں پھر سے اپنی روح اور دل میں اقبال کی شمع روشن کرنے کی ضرورت ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

کہ اگر تم مسلمان کی طرح رہنا چاہتے ہو تو یہ قرآن کے مطابق زندگی گزارے بغیر ممکن نہیں، یہ وہ وقت ہے جب ہمارے دانشوروں، روحانی اور سیاسی قائدین کو قرآن کی طرف سنجیدگی سے واپس آنا چاہیے، ہماری زندگی میں اس کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیے اور اس روشن پیغام کی روشنی میں اپنا مشن اور کردار متعین کرنا چاہیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

فقھی مباحث

(قسط-۲)

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور حکمِ شریعت

محمد قمر الزماں ندوی
استاد، مدرسہ نور الاسلام پرتاپگڈھ، جنرل سکریٹری مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی جھارکھنڈ

فکر و نظر کے چند گوشے

اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے جو سوالات ''اعضاء و اجزاء انسانی کا عطیہ'' کے موضوع پر موصول ہوئے ہیں ان سوالات کا تعلق چونکہ زیادہ تر اضطراری حالات سے ہے اس لئے اس کی مزید وضاحت ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

مسلمانوں کے لئے آج کے زمانے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ مغرب اور اہل مغرب سے اتنے متاثر ہیں کہ وہ ان کی ہر طرح کی ترقی اور ایجادات و اختراعات اور جدید طبی سہولیات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور یہ اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں جواز کا پہلو اگر نہیں نکالا گیا تو اسلام کو قدیم، فرسودہ اور بوسیدہ مذہب قرار دیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اسلام کے اندر جدید حالات اور مسائل کو حل کرنے اور اس سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اس لئے بہت سے علماء اور روشن خیال طبقہ چند فقہی قواعد کو قرآن مجید پر منطبق کر کے جواز کا راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ حضرات آناً فاناً الضرورات تبیح المحظورات، المشقة تجلب التيسير، الضرر يزال، اور اذا ضاق الأمر اتسع جیسے قواعد کا حوالہ دینے میں نہیں چوکتے اور فوراً جواز کا راستہ ہموار کر دیتے ہیں۔

بعض جدید طبی سہولیات اور ترقیات سے فائدہ اٹھانے اور نہ اٹھانے اور اس کے بہتر ہونے نہ ہونے کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والوں سے اس کا تعلق ہے، خود اہل مغرب یعنی عیسائیوں کے یہاں ان کی مذہبی کتابوں میں اس سلسلے میں صحیح رہنمائی موجود ہے کیوں نہ تمام مذاہب کے علماء کو مہمیز لگائی جائے اور فطرت انسانی کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صحیح نتیجے پر پہونچا جائے اور یہ صدا لگائی جائے "يا اهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا و بينكم۔

مثلاً انسانی اعضاء کو قطع و برید کر کے استعمال کرنا یہ انسانی شرافت و تکریم اور منشأ تخلیق کائنات کے بالکل منافی ہے۔ دنیا کے ہر دور میں عقلاء و حکماء نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا ہے کہ

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کاٹ تراش کر استعمال کرنا سنگین جرم اور سخت ناپسندیدہ ہے، اور یہ انسانیت کے ساتھ مذاق ہے، اس کی توہین وتذلیل ہے۔ اور تمام انبیاء علیہم السلام کی مختلف شریعتوں کا بھی اس پر اتفاق رہا ہے، مسیحی دنیا جو آج کل ان چیزوں میں پیش نظر آتی ہے اس کا بھی اصل مذہب یہی ہے، اسلام نے ایک انسان کے اعضاء کو دوسرے انسان کے لئے استعمال کرنا اس کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ بھی جائز نہیں رکھا اور نہ کسی انسان کو یہ حق دیا کہ وہ اپنا کوئی جز دوسرے کو معاوضہ یا بلا معاوضہ دے دے۔

اس لئے انسان کے عضو کا بدل جمادات یا نباتات وغیرہ سے تلاش کیا جائے، اور فنی مہارت کے ذریعہ اس کو کارآمد اور مفید بنایا جائے جیسے مصنوعی دانت، مصنوعی آلہ سماعت، پیس میکر وغیرہ کہ ان میں سے بعض کا زمانہ قدیم سے رواج ہے اور حال میں سائنسی ترقیات نے اس فن کو بامِ عروج پر پہونچا دیا ہے، اور ابھی اس میں ترقی کا بہت بڑا میدان ہے اور اس طرح کے مصنوعی اعضاء کا استعمال بعض صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے بھی کیا ہے۔

چنانچہ ابوداؤد، ترمذی اور مسند احمد کی روایت ہے کہ حضرت عرفجہ بن اسعد صحابیؓ کی ناک جاہلیت کی ایک جنگ کلاب میں کٹ گئی تھی انہوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگائی اس میں بدبو پیدا ہوگئی، رسول اللہ ﷺ نے ان کو سونے کی ناک لگوانے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد، ترمذی مسند احمد)

دوسری صورت یہ ہے کہ حیوانات کے اعضاء سے یہ کام لیا جائے، یہ بھی قدیم زمانہ سے مروج ہے، اور موجودہ طبی تحقیقات اور سرجری ترقیات نے اس فن میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر لی ہے اور انکشافات اور تحقیقات کے نئے نئے میدان وا ہو رہے ہیں، اگر اس فن پر حکومت پوری توجہ دے اور اس میدان کے ماہرین فن حضرات اپنی پوری توجہ مبذول کر دیں تو بعید نہیں کہ مزید راہیں کھلیں، انکشافات کی نئی نئی شکلیں وجود میں آئیں اور زیادہ سے زیادہ مفید اور کامیاب علاج اور سرجری کی صورتیں وجود پذیر ہوں۔

یہ دونوں صورتیں اکثر بلکہ تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہیں، اور یہ دونوں صورتیں دینی ودنیوی، شخصی، اور اجتماعی ہر حیثیت سے بے خطر وبے ضرر ہیں جبکہ پہلی صورت یعنی انسانی اعضاء سے دوسرے انسان کا علاج اور اس کے لئے اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ اور ہدیہ جو سوال اس وقت میرے پیش نظر ہے اس میں ظاہری اعتبار سے بلاشبہ بہت سے فائدے ہیں جن کا آج مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ ایک نابینا انسان کو دوسرے مردہ انسان کی آنکھیں لگا کر بینا کر دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ پہلے تک جگر کی پیوندکاری کو ناممکن سمجھا جاتا تھا لیکن جدید میڈیکل ترقی نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور فوراً اس کا جگر نکال دیا جائے تو وہ دوسرے کے کام آسکتا ہے، شاید ہندوستان میں بھی اس طرح جگر کے کئی کامیاب آپریشن ہو چکے ہیں۔

لیکن اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو یہ صورت پوری انسانیت کے لئے تباہی کا راستہ بن سکتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کی فکر انگیز تحریر اور بصیرت افروز

موقف: اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ کی ایک بصیرت افروز اور فکر انگیز تحریر بلکہ فتوی پیش خدمت ہے اور اعضاء و اجزاء کی سرجری میں انسانی اعضاء و اجزاء کے استعمال کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ اور علماء پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے علماء کا جو موقف ہے (بطور خاص حضرت استاد گرامی قدر مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی دامت برکاتہم) احقر کا اس سے سو فیصد اتفاق ہے۔ اور وہی میرا موقف ہے۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ جواہر الفقہ جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں:

''انسان کو جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا خاص مظہر بنایا ہے اور اس کے بدن میں بولنے، دیکھنے، سمجھنے وغیرہ کے لئے ایسی نازک خود کار مشینیں لگا دی ہیں کہ سائنس جدید و قدیم مل کر بھی اس کا کوئی حصہ بنا نہیں سکی۔ انسان کا وجود در حقیقت ایک چلتی پھرتی فیکٹری ہے جس میں سینکڑوں نازک مشینیں کام کر رہی ہیں، یہ سب مشینیں ان کے پیدا کرنے والے نے انسان کو ودیعت و امانت کے طور پر دی ہیں، اس کو ان چیزوں کا مالک نہیں بنایا۔ البتہ امانت کے طور پر دینے والے کریم مولا نے ان سرکاری مشینوں کے استعمال کی ایسی آزادانہ طاقت و اجازت دے دی ہے کہ اس سے اس کو یہ دھوکہ لگ جاتا ہے کہ میں اپنی جان اور اپنے اعضاء کا خود مالک ہوں مگر حقیقت حال یہ نہیں، اسی وجہ سے انسان کو جس طرح خودکشی کرنا حرام ہے اسی طرح اپنا کوئی عضو کسی دوسرے کو رضا کارانہ طور پر بلا معاوضہ دے دینا بھی حرام ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے قرآن وسنت کی واضح نصوص کی بنا پر فرمایا ہے کہ جو شخص بھوک پیاس سے مر رہا ہو اس کے لئے مردار جانور اور ناجائز چیزوں کا کھانا پینا تو بقدرِ ضرورت جائز ہو جاتا ہے مگر یہ بات اس وقت بھی جائز نہیں ہوتی کہ کسی دوسرے زندہ انسان کا گوشت کھالے اور نہ کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنا گوشت یا کوئی عضو دوسرے انسان کو بخشش کر دے کیوں کہ خرید و فروخت یا بخشش و ہدیہ اپنی مِلک میں ہو سکتا ہے۔ روح انسانی اور اعضاء انسانی اس کی مِلک نہیں جو وہ کسی کو دے سکے۔

آج کل ڈاکٹری اور سرجری کی نئی ترقیات نے فنی طور پر بلا شبہ اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے کہ ایک انسان کی آنکھیں دوسرے نابینا انسان کے چہرہ میں پیوست کر کے اس کو بینا کر دکھایا، ایک انسان کا گردہ، پتہ، پھیپھڑ دوسرے مریض انسان کے جسم میں لگا کر اس کو تندرست کر دینے کا کرشمہ دکھایا اور اس وقت یہ کام جس انداز اور پیمانے پر ہو رہا ہے اس میں بظاہر ان مضرتوں کی روک تھام کا انتظام کر لیا گیا ہے جو اس تماشے کے نتیجہ میں پورے انسانی معاشرے کو تباہی میں ڈال سکتی ہے۔

کیوں کہ ایسے اعضاء صرف خالص رضا کارانہ طور پر صرف ان لوگوں سے لئے اور دیے جاتے ہیں جو اس جہان سے گذر رہے ہیں خواہ کسی بیماری کی وجہ سے یا سزا کے طور پر قتل ہونے کی وجہ سے۔

لیکن دنیا کے تجربات رکھنے والا کوئی صاحب بصیرت ان وقتی پابندیوں پر مطمئن نہیں ہو سکتا، خدانخواستہ یہ طریق علاج رواج پا گیا تو اس کا ایک نقد نتیجہ تو یہ ہوگا کہ غریب انسان کی آنکھیں اور گردے اور دوسرے اعضاء ایک بکاؤ مال کی طرح

بازار میں بکا کریں گے، وہ اپنے بچوں کی خاطر یہ قربانی اپنی رضامندی کے ساتھ دے گا۔

مالداروں نے دنیا کی دولت اور سامانِ ضرورت وراحت سب سمیٹ کر اپنے گھروں میں بھر ہی لئے ہیں۔ جن سے کروڑوں غریب انسان محروم ہیں۔ مگر خالقِ کریم نے انسانی اعضاء واجزاء میں جو مساوات امیر وغریب کے درمیان قائم کر رکھی ہے کہ فاقہ زدہ فٹ پات پر بسر کرنے والے بچے کو بھی وہی صحیح سالم کان اور زبان ملتی ہے جو بڑے سے بڑے سرمایہ دار کو نصیب ہوتی ہے۔

اگر یہ چیزیں بھی بکاؤ مال بن گئیں تو بہت سے غریب اپنے بچوں کی مصیبت دور کرنے کے لئے اپنی یہ چیزیں بھی داؤ پر لگا دیں گے، اور دنیا کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ پھر یہ بگاڑ صرف یہیں نہیں رکے گا کہ رضا کارانہ طور کسی انسان کے اعضاء و اجزاء لئے جائیں بلکہ بہت سے مردے خصوصاً لا وارث مردے بہت سے اعضا سے محروم ہو کر اس دنیا سے جایا کریں گے، اور شاید اگلے دور کے حکماء انسانی اعضاء کو دیر تک کارآمد باقی رکھنے کا کوئی انتظام کر لیں جیسے آج کل انسانی خون بلڈ بنکوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے تو پھر کسی انسانی میت کی خیر نہیں۔ اور یہ غسل وکفن اور نماز جنازہ اور کفن ودفن کے سارے قصے ہی بے باق ہو جائیں۔

نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔

اور خدانخواستہ یہ سلسلہ بڑھتا رہا تو صرف اپنی موت مرنے والوں تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ اس کام کے لئے بہت سے انسانوں کے قتل کا ایک بازار گرم ہو جانا ممکن ہے جو پوری انسانی معاشرے کی تباہی کا اعلان ہے۔ نابینا کو بینا کرنے اور مریض کو تندرست کرنے کے لئے ہر زمانے میں علاج کے مختلف طریقے جاری رہے جو اکثر بیماریوں میں کامیاب ہوتے ہیں اور بہت سے بیمار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کوئی طریقۂ علاج ان کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکا۔

سرجری کے ان نئے طریقوں کی اگر بالفرض حلال و حرام اور انسانی معاشرہ کے آئندہ مصائب کے خطرات سے بالکل قطع نظر کر کے پوری حوصلہ افزائی کی جائے اور سب مل کر اس کے رواج دینے کی کوشش بھی کر لیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی اندھا نہیں رہے گا یا کوئی بیمار تندرستی سے محروم نہیں رہے گا۔

تجربہ شاہد ہے کہ ان نئی سے نئی ترقیات ہی کے آپریشن لاموں اور مریضوں کی قیام گاہوں اور ماہر ڈاکٹروں کے سایوں میں روزانہ ہزاروں مریض دم توڑ کر عدم کی سرحد پار کر لیتے ہیں، مغربی ممالک میں تبادلہ اعضاء کے ذریعہ علاج کرنے کا تجربہ سالہا سال سے ہو رہا ہے لیکن پلاسٹک سرجری کے مقابلہ میں وہ بہت کم کامیاب ہوا ہے اور اس سے دیرپا فوائد حاصل نہیں کئے جا سکے، امریکی رسالہ ''سیر بین'' اپنی ستمبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

''پہلے اس (آنکھ کے) پردے کو نقصان کی صورت میں اس کی جگہ وہ پردہ لگا دیا جاتا تھا جو ایسے لوگوں کے مرتے ہی ان کی آنکھ سے حاصل کر لیا جاتا تھا جو اسے بطور عطیہ دینا چاہتے تھے لیکن بعض ایسے اسباب کی بنا پر جنہیں ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے، اس طرح لگائے جانے والے بہت سے

پردے دھندلا جاتے تھے اور آدمی دوبارہ بصارت سے محروم ہوجاتا تھا (ص ۳۳)

اس کے علاوہ پلاسٹک سرجری نے حال ہی میں جو حیرت انگیز تجربات اور انکشافات کئے ہیں ان کی روشنی میں بات ثابت ہوچکی ہے کہ تبادلۂ اعضاء مشکوک اور مشتبہ ہونے کے علاوہ مشکل الحصول بھی ہے اور اس کے لئے ایک طویل عمل کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے باوجود اسے ہر جگہ استعمال نہیں کیا جاسکتا، مذکورہ رسالہ لکھتا ہے:

''سیلیکون اور اسی قسم کے دوسرے مرکبات کے اطمینان بخش طور پر قابل استعمال ہونے سے قبل سرجنوں کو اس قسم کے اعضاء تبدیل کرنے کے لئے کرّی زندہ ہڈیوں اور سیچوں پر اعتماد کرنا پڑتا تھا، اس طریقہ کی وجہ سے مریض پر بالعموم آپریشن کرنے پڑتے تھے۔ پہلے آپریشن کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ اگر کسی دوسرے شخص یا جانور کے جسم سے حاصل شدہ پیوند لگانے کی کوشش کی جاتی تو مریض کا جسم اسے قبول نہ کرتا اور اس کے خلاف ایک حیاتیاتی مزاحمت شروع کر دیتا تاہم مریض کے اپنے جسم کے ایک حصے سے پیوند لے کر دوسرے حصہ میں لگانے کے طریقوں کے بہت بہتر ہوجانے کے باوجود بھی بعض مسائل حل طلب رہ گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کبھی کبھی نیا پیوند کامیابی کے ساتھ لگائے جانے کے مہینوں بعد جاکر جسم کے سیال اسے قبول کرتے تھے۔

اب سیلیکون کے اعضاء بن جانے کے بعد مجروح یا مریض اعضاء کو زندگی بھر کے لئے تبدیل کیا جا سکتا ہے'' (حوالۂ مذکور) ایسی حالت میں کسی وقتی اور شخصی مصلحت کے لئے پوری قوم کو تباہی کے راستہ پر ڈالدینا کوئی دانشمندی کا کام نہیں کہا جاسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے آفت زدہ اعضاء کی جگہ دوسرے اعضاء کا پیوند لگانے کی تین صورتوں میں سے پہلی اور دوسری صورت بے خطر و بے ضرر بھی ہے اور شریعت و مذہب کی رو سے حلال بھی، تیسری صورت انسان کے اجتماعی مفاد کے لئے مضرت رساں بھی ہے اور شرعاً حرام و ناجائز بھی جس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

اس لئے انسانی فلاح کا بے خطر راستہ یہی ہے کہ ڈاکٹری اور سرجری کے ماہرین اپنی ریسرچ و تحقیق کی پوری توانائی پہلی صورتوں پر خرچ کریں تو بہت امید ہے کہ جن معالجات کے لئے انسانی اعضاء کی قطع و برید کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے وہ سب انہیں دو صورتوں سے پوری ہوجائیں۔ اور حال میں میرے اس خیال کی تائید اس مقالہ سے پوری طرح ہوتی ہے جو امریکی شعبہ اطلاعات پاکستان کے ماہنامہ سیر بین کے تازہ شمارہ ۶۷۵ء میں مصنوعی فاضل اعضاء کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے کچھ اقتباسات ابھی ذکر کئے گئے ہیں'' (جواہر الفقہ جلد دوم صفحہ ۴۳-۴۸)

اسلامک فقہ اکیڈمی سے موصول سوالات کے جوابات

اس طویل تمہید اور تعارفی کلمات کے بعد اب خاکسار اکیڈمی کی جانب سے ''اعضاء و اجزاء انسانی کا عطیہ'' کے موضوع پر آئے سوالات کا جواب ترتیب وار پیش کر رہا

ہے۔ موضوع کی اہمیت اور حساسیت کی بنا پر تمہیدی اور تعارفی کلمات کو طول دینا پڑا، احقر نے تمہیدی اور تعارفی کلمات میں اپنا موقف ظاہر کر دیا ہے اور اجمالا سوالات کے جوابات بھی آ گئے ہیں۔

سوال نمبر (۱) کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو ضرورت کی بنا پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

خون کا عطیہ:

ضرورت پڑنے پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو یا غیر مسلم کو بھی ضرورت کی بناء پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے، اس مسئلہ قریب اکثر علماء اور اہل افتاء کا اتفاق ہو چکا ہے۔ عصرِ حاضر میں یہ ایک عظیم انسانی خدمت متصور ہوگا، خون اگر چہ جزء انسانی ہے مگر اس کو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس حیثیت سے اس کی مثال انسانی دودھ کی سی ہوگئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نکلتا ہے، اور دوسرے انسان کے بدن کا جزء بنتا ہے، اور شریعت اسلامی نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور بچوں کو ماں کا دودھ پلانا صرف جائز نہیں بلکہ عام حالات میں واجب قرار دیا گیا ہے۔

بچوں کے علاوہ بڑوں کے لئے بھی دوا و علاج کے لئے عورت کے دودھ کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے "ولا بأس بأن يسعط الرجل بلبن المرأة ويشربه للدواء" (جواہر الفقہ دوم ۳۷/ عالمگیری ۱۱۲/ج ۴)

اس لئے جزء انسانی ہونے کی حیثیت سے اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید قیاس نہیں لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح شریعت اسلامی نے عورت کے دودھ کو جزء انسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی بنا پر بچوں کے لئے جائز قرار دیا ہے اسی طرح ضرورت کی بنا پر خون دینا اور اس کا عطیہ کرنا بھی جائز ہے۔ دودھ اور خون میں یہ امر قدرِ مشترک ہے کہ یہ دونوں انسانی جسم سے اخراج کے بعد دوبارہ بہت جلد اپنی کمی پوری کر لیتے ہیں۔ اور یہ دونوں سیال اجزاء ہیں فرق یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک ہے۔

جن فقہاء کو خون کے استعمال اور دوسرے کے بدن میں داخل کرنے میں تأمل ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ خون انسان کا جزء ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس اور ناپاک بھی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ عام حالات میں ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا حرام ہو۔ اجزاء انسانی کی تکریم کا بھی یہی تقاضہ ہے، اور اس کا نجاست غلیظہ ہونا بھی حرمت ہی کا مقتضی ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات اور دواء میں شریعت اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے جو چیزیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ خون کے استعمال کی حرمت دو وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ خون انسانی جزء ہے اور جزء انسانی کا استعمال شریعت میں جائز نہیں ہے۔ دوسری وجہ حرمت کی یہ ہے کہ خون نجس اور حرام ہے۔

ان دونوں وجہوں کا جواب یہ ہے کہ جہاں خون کے انسانی جزء ہونے کا تعلق ہے تو اس میں غور کرنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ خون اگر چہ جزء انسانی ہے مگر اس کو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں قطع و برید اور سرجری کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے۔ اس لئے اس حیثیت سے اس کی مثال انسانی دودھ کی سی ہوگئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نکلتا ہے۔ جہاں تک خون کے استعمال کا مسئلہ ہے کہ وہ حرام اور ناپاک ہے، لہذا یہ تداوی بالمحرم میں داخل ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرام اشیاء کا بھی علاجاً استعمال کرنا درست ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حرام اشیاء سے علاج کو منع کیا ہے، مگر فتویٰ اس سلسلے میں امام ابو یوسف کے قول پر ہے جو بعض احادیث کی بنا پر اس کو درست قرار دیتے ہیں۔

"یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی إذا اخبره طبیب مسلم ان شفاه فیه ولم یجد فی المباح ما یقوم مقامه، وإن قال الطبیب یستعجل شفاء ك فیه وجهانِ، (الفتاویٰ الھندیہ ۳۵۵/۵)

کسی مریض کو بطور علاج، مردار کھانا خون اور پیشاب کا پینا جائز ہے، بشرطیکہ کوئی مسلمان طبیب اس بات کی اطلاع دے کہ اس کے لئے اس میں شفا ہے، اور جائز چیزوں میں کوئی ایسی چیز نہ ملے جو اس کی جگہ لے سکے، اور اگر طبیب کہے کہ اس کے ذریعہ شفا جلد ہوگی (گویا دوسری مباح چیزوں سے بدیر صحت یابی متوقع ہو) تو ایسی صورت میں دو قول ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی کو سونے کی ناک بنانے کی اجازت دی، جبکہ سونے کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے۔ اسی حدیث کی بنا پر فقہاء نے دانت وغیرہ میں سونے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔

غیر مسلم کو خون کا عطیہ

ضرورت پڑنے پر ایک غیر مسلم کو بھی خون کا عطیہ دیا جا سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات اگر مذہبی منافرت کو دور کرنے اور مذہبی ہم آہنگی پیدا کی ضرورت ہو تو وہاں مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینا چاہیے، اور پیش قدمی کرنی چاہیے۔ دوسری چیز یہ کہ پوری انسانیت کو اللہ کا کنبہ کہا گیا ہے، اس اعتبار سے اس حدیث سے جواز ثابت ہے، لیکن جہاں تک مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی غیر مسلم کا خون مسلم کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے؟ اور کسی مسلمان کا غیر مسلم کا عطیہ کیا ہوا خون لینا جائز ہے؟

تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نفسِ جواز میں کوئی فرق نہیں لیکن ظاہر ہے کہ کافر یا فاسق و فاجر انسان کے خون میں جو اثرات خبیثہ ہیں ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا خطرہ قوی ہے۔ اسی لئے صلحاء امت اور بزرگانِ دین نے فاسق فاجر عورت کا دودھ پلوانا بھی پسند نہیں کیا۔ اس لئے بہتر اور مناسب یہ ہے کہ حتی المقدور کافر فاسق اور فاجر انسان کے خون سے اجتناب کرے اور ان کا عطیہ کیا ہوا خون بلا ضرورت شدیدہ قبول نہ کرے۔

الغرض انسان ہونے کے لحاظ سے تمام انسانوں کے جسم

یکساں حیثیت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی طرح کافروں، پرہیزگاروں کی طرح گنہگاروں کا جھوٹا بھی پاک ہے، یہی حکم خون چڑھانے اور خون کا عطیہ کرنے کا ہے، البتہ اگر اس میں احتیاط ممکن ہو تو وہ بہتر ہے، ورنہ خون ہر قسم کے آدمی کا چڑھایا جاسکتا ہے، اور غیر مسلم کو بھی خون کا عطیہ کیا جا سکتا ہے، اس کے جواز میں تقریباً تمام علماء کا اتفاق ہے۔

سوال نمبر (۲) کا جواب:

کیا بلڈبینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں

عام حالات میں (حالات کے فرق کے ساتھ) فقہاء نے خون دینے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ اس طرح ہیں:

مریض کو خون دینے کی تفصیل

(۱) جب خون دینے کی ضرورت ہو، یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو، اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو۔ تو خون دینا جائز ہے۔

(۲) جب ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دینے کی حاجت ہو، یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو لیکن ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیئے بغیر صحت کا امکان نہ ہو اس وقت بھی خون دینا جائز ہے۔

(۳) جب خون دینے کی گنجائش ہے مگر اس سے اجتناب بہتر ہے، لما فی الهندية وان قال الطبيب يتعجل شفائك فيه وجهان (۳۵۵ج۵)

(۴) جب خون دینے سے محض منفعت یا زینت مقصود ہو، یعنی جب ہلاکت یا مرض کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو بلکہ محض قوت بڑھانا یا حسن میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں خون دینا ہرگز جائز نہیں۔ (جواہر الفقہ جلد دوم صفحہ ۳۸)

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ عام حالات میں مسلمانوں کے لئے ایسے بلڈ بینکوں میں خون کا عطیہ مناسب نہیں ہے، کیوں کہ یہ ضرورتِ شدیدہ نہیں ہے، ہاں اگر ہنگامی اور غیر معمولی حادثات پیش آجائیں تو اس موقع پر مسلمانوں کو زخمیوں کو بچانے کے لئے جبکہ ان زخمیوں کو خون کی ضرورت ہو رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ کرنا چاہیے۔ محض امکانی ضرورتوں کے لئے بلڈ بینک میں خون جمع کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ انسانی اجزاء کے سلسلے میں مسئلہ یہی ہے کہ لین دین سے بچا جائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر معتبر طبیب کی رائے کے مطابق خون چڑھانا مریض کے لیے ضروری ہو تو ایسے مریض کو خون دینا جائز ہے۔ يجوز بعليل شرب الدم .....إذا اخبره مسلم أن شفاء ه فيه الخ (الفتاویٰ الھندیہ ۳۵۵/۵)

لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب بحالت موجودہ کوئی ایسا مرض پیدا ہو گیا ہو کہ بہت سے لوگوں کو خون کی ضرورت ہو اور اس کے لینے بلڈ بینک میں خون جمع کرنا ضروری ہو، تو ایسی صورت میں بھی خون دیا جا سکتا ہے، محض امکانی ضرورتوں کے لئے خون دینا درست نہیں، کیوں کہ انسانی اجزاء کے سلسلے میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کے لین دین سے بچا جائے، تاہم یہ احکام اس وقت ہیں جب بلا قیمت رضا

کارانہ خون دیا جائے، خون کا فروخت کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ (کتاب الفتاویٰ جلد ۶ رصفحہ ۲۱۴)

سوال نمبر (۳) کا جواب

مسلمانوں کا رضاکارانہ بلڈ بینک قائم کرنا کیسا ہے؟

عام حالات میں محض امکانی ضرورتوں کے لئے مسلمانوں کا رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ خدمت خلق کے جذبے سے بھی کسی کام کو انجام دینے کے لئے شریعت کے اصولوں اور ضابطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، محض دوسروں کی نقل میں کسی کام کا کرنا اور انجام دینا اور اس کام کو بہتر اور مستحسن تصور کرنا، جبکہ شریعت کے اصول وضوابط سے وہ کام ٹکرا رہا ہو کبھی بھی بہتر نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ کی تاریخ ولادت کے موقع پر اگر کوئی شخص ہسپتال جا کر خون کے ضرورت مند مریضوں کو اپنا خون دیتا ہے تا کہ ہزاروں برادران وطن پر اس کا اچھا اثر مرتب ہو اور غیر مسلموں میں یہ تأثر پیدا ہو کہ مسلمانوں کے پاس صرف لینے والا ہاتھ نہیں ہے بلکہ دینے والا ہاتھ بھی ہے تو ایسے موقع پر مسلمانوں کو آگے آگے رہنا چاہیے، اور اسلام کی شبیہ کو بہتر بنانے کے لئے مسلمانوں کو دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیے لیکن اس کے لئے بھی شرط یہ ہے کہ شریعت کے اصول اور حکم منصوص کی خلاف ورزی نہ ہو۔

سوال نمبر (۳) کا جواب:

خون کے عطیہ کے سلسلے میں ایک سوال کا جواب:

اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرور ہو لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو، اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو کیا ایسے شخص کو اس مریض کو خون دینا واجب ہوگا؟ یا مستحب اور جائز؟

صورت مسئلہ میں ایسے شخص کا خون دینا جائز ہوگا، واجب اور مستحب نہیں، فقہاء لکھتے ہیں: جب خون دینے کی ضرورت ہو، یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو، اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو تو خون دینا جائز ہے۔

لیکن اگر مریض کی ہلاکت یقینی ہو کہ اگر اس کے بدن میں مطلوبہ گروپ کا خون داخل نہ کیا گیا تو وہ شخص مر جائے گا، اور اس گروپ کے خون کا حامل اس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ملے ہی نہ، اور اس شخص کے اندر مطلوبہ خون دینے کی صلاحیت ہو اور خود اس شخص کے بیمار اور کمزور ہونے کا خطرہ نہ ہو تو احقر کی رائے میں ایسے شخص کے لئے مستحب ہی نہیں بلکہ خون کا دینا واجب ہونا چاہیے (واللہ اعلم بالصواب)

انسانی جان کو بچانے کے لئے حالتِ اضطرار میں خاص شرائط کے ساتھ بہت سے وہ کام اور وہ چیزیں انسان کے لئے جائز کر دی گئی ہیں جو عام حالات میں حرام اور ناجائز ہیں۔

لہذا اگر اس شخص کے خون دینے سے اس شخص کی زندگی بچ سکتی ہے تو خون دینا جائز ہی نہیں بلکہ مستحب اور قریب الواجب ہونا چاہیے۔ ☆☆☆

(جاری)

فاتحین اسلام

سلطان صلاح الدین ایوبی

تحریر: عبدالمنعم الہاشمی.....ترجمانی: محمد عالم ندوی مرادآبادی

سلجوقی سلاطین نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو ملک شام تک وسیع کرلیا تھا۔شہر موصل کی ولایت عمادالدین زنگی اتابک کے سپرد تھی، عمادالدین زنگی نے عیسائیوں سے چند معرکوں کے بعد شہر ''رہا'' پر قبضہ کرلیا، دوسال کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اپنا جانشین اپنے بیٹے نورالدین محمود کو بنایا، نورالدین بھی اپنے والد کی طرح عیسائیوں سے معرکہ آرا رہا، یہاں تک کہ دمشق پر قابض ہوگیا، اس وقت سلجوقی سلطان محی الدین ارتق تھا جس کی کمزوری کے باعث اس کی سلطنت صلیبیوں کی نظر میں کھٹک رہی تھی، اور کسی طرح اس پر قابض ہونا چاہتے تھے، نورالدین کی دوراندیش نگاہیں اس خطرہ کو بھانپ رہی تھیں، نورالدین نے اس خطرہ کے دفاع اور شمالی شام کی دشمن سے حفاظت کے لئے ایک مضبوط اسلامی سلطنت کو اس خطہ میں قائم کیا، یہ اسلامی سلطنت لاطینی اور صلیبی تحریکات پر بھاری پڑی۔

مصر اس وقت فاطمی حکومت کے زیر سایہ تھا لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، فاطمی خلفاء باغی وزراء کے نشانہ پر تھے، سلطنت قتل وغارت گری کا شکار تھی۔

۵۴۴ھ ۱۱۴۹ھ میں ظاہر بامر اللہ مسند نشیں ہوا اور پانچ سال کے بعد اس کے وزیر ملک العادل ابن السلام نے اس کو قتل کردیا، ظاہر بامر اللہ کے بعد اس کا نوعمر لڑکا فائز بنصر اللہ جانشین نامزد ہوا، اسی کے دور میں صلیبی مصر کے سرحدی شہر عسقلان پر قابض ہوگئے، قصر نسواں سے طلائع بن زریک جو کہ زلموپین کا سربراہ تھا، مدد طلب کی گئی یہ ایک قد آور شخص تھا اس نے عربی قبائل میں سے اپنے انصار ومددگار کے ساتھ قاہرہ کا رخ کیا وہاں پہونچ کر منصب وزارت حاصل کیا اور اپنے لئے ملک الصالح کا لقب اختیار کیا، ملک الصالح نے اپنے عزم وحوصلہ سے نظام سلطنت کو مضبوط کیا اور یہ کوشش کی کہ پہلے مصر وشام کو متحد کیا جائے تاکہ صلیبی خطرہ کو آسانی سے ختم کیا جاسکے، اسی غرض سے نورالدین سے مدد طلب کی چونکہ نورالدین کو مصری قیادت پر یقین نہیں تھا اس لئے کوئی جواب نہ دیا۔

۵۵۶ھ مطابق ۱۱۶۰ء نوعمر خلیفہ فائز بنصر اللہ کا انتقال ہوا، ملک الصالح نے اس کی جگہ ۹ سالہ عاضد لدین اللہ کو اس کا جانشین مقرر کیا، لیکن چند دنوں کے بعد قصرِ نسواں کی دسیسہ کاری سے صالح کو قتل کردیا گیا، صالح کا جانشین اس کے بیٹے رزیک نے منصب وزارت کو سنبھالا، حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی، شاور بن مجری السعدی والی قوص کی جانب سے بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے رزیک نے شاور کو اس کے عہدہ

سے معزول کر دیا، شاور نے سخت مخالفت کی اور ایک بڑی جمعیت کے ساتھ رزیک سے مقابلہ کے لئے قاہرہ کی جانب بڑھا، رزیک کو شکست ہوئی اور قتل کر دیا گیا، شاور نے منصب وزارت سنبھالا یہ ۱۱۶۳ء ۵۵۸ھ کے واقعات ہیں، شاور کو منصب وزارت سنبھالے ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ضرغام بن عامر الخمی نے بغاوت کی اور شاور سے اقتدار کی کنجی چھین لی، اور اپنے کو ملک المنصور کے نام سے موسوم کیا، شاور نے شام کا رخ کیا وہاں کے بادشاہ نورالدین سے مدد طلب کی، نورالدین شروع میں اس کی مدد طلبی پر پس وپیش میں پڑا رہا لیکن صلیبیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے بادشاہ اما الریک کی قیادت میں مصر پر چڑھائی کی، شروع میں فرنگیوں کو ضرغام کی جانب سے شکست کا سامنا کرنا پڑا، نورالدین کے پاس یہ خبریں متواتر پہونچ رہیں تھیں کہ ضرغام فرنگیوں کے ساتھ مصالحت واتحاد کی کوشش میں ہے، جس سے یہ اندیشہ ہے کہ فرنگی مصر پر قابض ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے، نور الدین نے مصر پر حملہ کی تیاری کی، ایک بڑی فوج کو شاور کے ساتھ جس کی قیادت اسدالدین اور صلاح الدین کر رہے تھے مصر کی جانب روانہ کیا، ۵۵۸ء میں لشکر مصر پہنچا اور یہیں سے صلاح الدین کی زندگی کا زریں دور شروع ہوتا ہے، صلاح الدین کی آمد کے وقت مصر کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اپنی کمزوری کا شکوہ تھا، مغربی دشمن کی یلغاریں ان کو مزید کمزور کر رہیں تھی، فرنگی صلیبیوں نے ام کی سرحدوں پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے تھے، اس کے بعد پہلے بیت المقدس فتح کیا، اور پھر شرق اسلامی کے قلب وجگر میں لاطینی حکومت کی بنیاد ڈالی گویا کہ یہ تمہید تھی مشرق اسلامی کو اس کے تہذیبی اور روحانی سرمایہ سے دور کرنے کی، قبل اس کے کہ ہم ان واقعات کی تفصیل میں جائیں، ملت اسلامیہ کے اس عظیم فرزند سلطان صلاح الدین ایوبی کی نشو نما کے متعلق گفتگو کرتے ہیں جس کی زندگی میں اسلام دشمن طاقتیں ابھر نہ سکیں۔

سلطان کی پرورش و پرداخت

سلطان کی ولادت ۵۳۲ھ مطابق ۱۱۳۷ء بغداد وموصل کے درمیان نہر دجلہ کے کنارے ایک قلعہ تکریت میں ہوئی، سلطان کے جد امجد ''شادی'' کا تعلق کردوں کے ایک بڑے قبیلے زوادیۃ سے تھا، یہ اصل میں آذربائجان کے ایک شہر دوین کے رہنے والے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے نجم الدین ایوب۔ اسد الدین شیرکوہ، یہ خاندان عراق آیا اور مجاہد الدین بہروز سے متعلق ہوا جو کہ سلطان مسعود سلجوقی کی جانب سے فوجی کمانڈر تھا۔ بہروز نے نجم الدین ایوب کو قلعہ تکریت کا حاکم مقرر کیا، یہیں سلطان کی پیدائش ہوئی چند دنوں کے بعد بہروز اور دونوں بھائی نجم الدین واسد الدین کے درمیان دوریاں بڑھنے لگیں، اس کی وجہ یہ بنی کہ دونوں بھائیوں نے بہروز کے فریق عماد الدین زندگی والی موصل سے رسم وراہ پیدا کر لی تھی، دونوں بھائیوں نے قلعہ تکریت کو چھوڑ کر شہر موصل کا سفر کیا، جب عماد الدین نے بعلبک کو فتح کیا تو وہاں کا حاکم نجم الدین کو بنایا، عماد الدین کچھ دنوں کے بعد قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا نور الدین محمود جانشین مقرر ہوا، اب دونوں بھائی نور الدین کے خاص مشیر کار بن گئے، شیرکوہ نے بہت سارے مواقع پر اپنی بہادری اور فوجی صلاحیت دکھا کر فوجی کمانڈر کا عہدہ حاصل کیا، سلطان کی نشو ونما اپنے والد نجم الدین ایوب کے زیر سایہ ہوئی جو کہ فن سپہ گری اور شہسواری کا ماہر تھا اور نورالدین کی جانب سے فوجی خدمت پر مامور تھا۔ دوسری جانب شرافت ونجابت خدا کی جانب سے فطرت میں ودیعت کی گئی تھی، سلطان کا چچا

شیرکوہ جب شامی فوج کی قیادت کرتے ہوئے مصر کی جانب بڑھا تو سلطان اس کے ہراول دستے میں تھا۔

جب والیٔ مصر ضرغام ملک المنصور کو شاور کی معیت میں شامی لشکر کی آمد کا پتہ چلا تو جنگ کے لئے نکل آیا، دونوں فوجیں بلبیس کے مقام پر معرکہ آرا ہوئیں ضرغام کو شکست ہوئی، وہ اپنی باقی ماندہ فوج کو لے کر قاہرہ لوٹ آیا، شاور نے پیش قدمی اور فسطاط پر قابض ہوگیا، ضرغام کچھ دن تک تو قاہرہ میں جما رہا، لیکن زیادہ تر فوج اس سے بدظن ہوچکی تھی، بالآخر عوام کے غضب کا شکار ہوکر قتل کر دیا گیا، شاور نے قاہرہ میں داخل ہوکر اقتدار پر پھر سے قبضہ کیا، چند ہی روز کے بعد شاور کو نورالدین کی اقتدار میں شرکت ناگوار گزرنے لگی، نورالدین شاور کی خودسری دیکھ کر اپنے بھتیجے صلاح الدین کو شاور کی سرکوبی کے لئے بلبیس کی جانب روانہ کیا، شاور نے انگریزی صلیبیوں سے مدد مانگی اور ایک لشکر جرار لے کر مصر کی جانب بڑھا لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی اور صلح پر دونوں فریق راضی ہوگئے، شاور اپنے لشکر کو لے کر شام لوٹ گیا، لیکن انگریزی صلیبیوں سے برابر اپنی رسم وراہ جاری رکھی، کیونکہ نورالدین کی فاتحانہ فطرت سے اس کو ہر وقت خوف لگا رہتا تھا اس لئے برابر انگریزی صلیبیوں سے مدد واعانت کی التجا بھی کرتا رہتا، دوسری جانب نورالدین کو ہر وقت اس بات کا خوف ستا رہا تھا کہ کہیں شاور کی ناعاقبت اندیشی سے صلیبی مصر پر قابض نہ ہو جائیں اگر ایسا ہوا تو یہ پورے مشرق وسطی کی پیشانی پر بدنما داغ ہوگا۔

مصر میں شیرکوہ کی آمد اور صلیبیوں سے کشمکش کی ابتداء

نور الدین اور شیرکوہ نے مصر پر قابض ہونے کی تمام تدبیروں کو بروئے کار لانا شروع کر دیا نورالدین نے شیرکوہ اور صلاح الدین کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ مصر کی جانب روانہ کیا۔ ادھر شاور کی امداد طلبی پر صلیبی انگریز ۵۶۴ھ/۱۱۶۷ء کو مصر کی جانب بڑھے ایک ہی وقت میں دونوں لشکر فسطاط پہونچے۔ انگریزی شہنشاہ اماالریک نے خلیفہ عاضد سے ایک معاہدہ کیا جس میں یہ شرط تھی کہ خلیفہ انگریزوں کا ان کے دشمن سے بارہ سو ریزگاری کے بدلہ میں دفاع کرے گا، اس معاہدہ کے فوراً بعد بعد شیرکوہ اور انگریزوں کے درمیان اسکندریہ کے میدان میں ایک جنگ ہوئی، جنگ اس معاہدہ پر ختم ہوئی کہ شیر کوہ شام لوٹ جائے، انگریز اپنے ملک جائیں اور مصر مصریوں کے لئے چھوڑ دیا جائے، اس کے بعد بھی شاور نے اپنے مکر اور چالبازی سے مصر پر قابض ہونے کی کوشش کی لیکن چند دنوں کے بعد قتل کر دیا گیا اس کے قتل کے بعد خلیفہ عاضد شیرکوہ سے درخواست گزار ہوا لیکن شیرکوہ بھی چند دنوں کے بعد چل بسا، خلیفہ عاضد نے صلاح الدین سے مدد مانگی اور اس کو خلعت وزارت سے نوازا، عاضد کا خیال تھا کہ صلاح الدین اپنے چچا شیرکوہ کے مقابلہ میں کمزور ہے اور فن سپہ گری میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ اپنے مقصدِ میں کامیاب ہوکر مصر پر قابض ہوجائے اور پھر حکومت کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی جائے گی جو اس میدان کا آزمودہ کار شخص ہوگا۔ عاضد کا خیال کسی حد تک صحیح تھا کیوں کہ سلطان کو حکومت کے انتظام وانصرام سے خاص دلچسپی نہ تھی جب عاضد نے سلطان سے مدد مانگی تو اس کو سلطان نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی اور ہر ناحیہ سے انکار کیا، حکومت کے تمام عہدوں ومناصب سلطان نے اپنے خداندان والوں کے سپرد کر رکھے تھے لیکن خدا کی قدرت سے کچھ ایسے مواقع پیش آئے جن کے ذریعہ سلطان میدان کارزار کا ایک بہادر سپاہی بن گیا، خلیفہ عاضد کے گزر جانے

کے بعد سلطان نے مملکت فاطمی کو اپنے قبضہ میں کیا اور نور الدین کے حکم سے خلیفہ عباس مستضی بامر اللہ کا نام خطبہ میں پڑھنا شروع کر دیا۔محلات فاطمی کے غلاموں اور باندیوں میں سے کچھ کو بیچ ڈالا اور بعض کو آزاد کر دیا۔

ادھر نور الدین سلطان کے موقف اور اس کے آزادانہ اختیارات پر چیں بہ جبیں تھا،اس لئے اس نے اپنے وزیر موفق الدین خالد بن القیر انی کو صلاح الدین سے قصور فاطمی کے حساب و کتاب لینے کی غرض سے بھیجا، جبکہ سلطان سونے چاندی سے مرصع بہترین قسم کے تحائف اور چھ ہزار دینار سلطان کی خدمت میں بھیج چکا تھا،لیکن سلطان کے تعلق سے بے اعتمادی کی کیفیت نور الدین کے دماغ میں بس چکی تھی یہاں تک کہ نورالدین کو سلطان کی جانب سے بغاوت کا خوف ہونے لگا،لیکن قدرت کی جانب سے نور الدین کی قضاء کا فیصلہ ہو چکا تھا شوال ۵۶۹ھ مئی ۱۱۷۴ء میں انتقال کر گیا،نور الدین کا جانشین اس کا بیٹا اسماعیل ہوا،اس نے بڑی چا بک دستی کے ساتھ مصر وشام کو متحد کرنے کی کوشش کی تا کہ صلیبیوں کی مصر میں داخلہ کی کوشش ناکام ہو جائے،لیکن اسکی زندگی بھی انہی فتنوں اور ہنگاموں کی نذر ہوگئی،اب سلطان نے شام کا رخ کیا اور تقریبا دو مہینہ تک دمشق اور اس کے قریبی علاقہ اہل حلب وغیرہ سے جنگ ہوتی رہی،اس دوران سلطان نے کچھ مضبوط قلعوں پر قبضہ کر لیا،مصاب مرکز اسماعیلی کا محاصرہ کیا لیکن قابض نہ ہو سکا،مصر سے کچھ فوج کو طلب کیا تا کہ اس کی مدد سے صلیبیوں کے چند علاقائی حملوں کو ختم کیا جا سکے۔

خلیفہ عباسی کے مطالبہ پر مصر وشام کی سلطنت سلطان کے ذمہ

سلطان صلاح الدین نے اپنی تمام فتوحات اور خطبہ میں خلیفہ عباسی کا نام پڑھنے کے تعلق سے سب کچھ مستضی بامر اللہ کو لکھ بھیجا۔خلیفہ کی جانب سے سرکاری اعزازات کے ساتھ قاصد آنے شروع ہو گئے خلیفہ نے مصر وشام اور سلطان کے مفتوحہ علاقوں کی سلطنت اسی کے سپرد کر دی،جب سلطان کو یہ احساس ہو گیا کہ شام کی طرح مصر کی فضاء بھی اس کے لئے پر امن ہوگئی تو شام میں اپنے بھائی شمس الدولۃ توران شاہ بن ایوب کو خلیفہ بنا کر اکتوبر ۱۱۷۹ء میں قاہرہ مصر سے لوٹ آیا۔۔۔

سلطان کے لئے ایک قلعہ کی تعمیر

سلطان کو عاضد کے زمانہ میں وزارت سے نوازا گیا تھا اسی وقت سے سلطان دار الوزارۃ میں رہا کرتا تھا جس میں اسکے چچا رہا کرتے تھے،اور کبھی بھی قصور فاطمی میں داخل نہیں ہوا یہاں تک کہ کہ محلات کے خالی ہونے کے بعد بھی۔لیکن جب علویوں کی جانب سے سلطان کے خلاف سازشیں رچی جانے لگیں اس وقت سلطان نے ایک مضبوط قلعہ کی تعمیر کو مناسب سمجھا تا کہ وہ مستقل اس کا ٹھکانہ اور مرکز حکومت ہو،اپنی اس خواہش کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے وزیر بہاء الدین قراقوش کو دی۔قراقوش نے قلعہ الجبل کے نام سے ۵۴۹ھ ۱۱۷۴ء میں ایک مشہور قلعہ تعمیر کرایا قلعہ اور قاہرہ کو شہر پناہ سے گھیرا،ان تمام منصوبوں کو پورا کرنے میں سلطان کے وزیر قراقوش نے بڑی ہمت سے کام لیا،مصر سے ملے ہوئے چھوٹے چھوٹے اہرام تڑوا دیے قلعہ اور شہر پناہ کی تعمیر میں مضبوط قسم کے پتھروں کا استعمال کیا اس شہر پناہ کی کشادگی ۲۴ کلو میٹر کی تھی اسی طرح سلطان نے اہرام کے سامنے ایک عمدہ قسم کا پل تیار کرایا اسکندریہ کا جہازی بیڑا بنوایا،ان تمام منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنونچانے میں سلطان کا داہنا ہاتھ قراقوش بنا ہوا تھا۔

صلیبیوں سے کشمکش کی ابتداء

سلطان نے مصر وشام کی سلطنت کو متحد کیا۔ صلیبی طاقتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے، شرق اسلامی کو دشمن کے قبضہ سے آزاد کرانے کی غرض سے ۵۷۳ھ ۱۱۷۷ء میں عسقلان کی جانب بڑھا اور وہاں سے رملہ گیا رملہ کے قریب بیت المقدس کا بادشاہ بلدوین ملک کی قیادت میں صلیبیوں سے جھڑپ ہوئی، سخت معرکہ ہوا جس میں سلطان کو شکست ہوئی، بہت سے مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا اور بعض کو قید کر لیا گیا، سلطان قاہرہ واپس آیا لیکن شکشت کے احساس نے ایک پل سکون سے بیٹھنے نہ دیا، پھر سے لشکر تیار کرنا شروع کیا اور ایک نئے حملہ کے لئے ایک بڑی فوج جمع کی، مذکورہ سال شعبان کے مہینہ میں مصر میں اپنے بھائی عادل کو خلیفہ بنا کر قاہرہ سے دمشق چلا آیا، صلیبی اس وقت حماۃ آئے ہوئے تھے۔ جب ان کو سلطان کی آمد کا علم ہوا تو وہاں سے کوچ کر گئے اگلے سال سلطان اور صلیبیوں کے درمیان چند معرکہ پیش آئے اور سلطان نے طبریہ و بیروت میں صلیبیوں کے مضبوط قلعوں پر چند کامیاب حملے کئے، محرم ۵۷۵ھ جو ۱۱۷۹ء میں سلطان اپنی فوج لے کر جس میں صمصام الدین اجک بھی تھا، بانیاس کی جانب نکلا، وہاں صلیبیوں کی ایک مسلح فوج بیت المقدس کے بادشاہ بلدوین کی قیادت میں مقابلہ کے لئے تیار تھی، حمص کے قریب سخت معرکہ پیش آیا، جس میں صلیبی بری طرح بسپا ہوکر بھاگے، بہت سے مشہور شہسواروں کو سلطان نے قید کیا جن کو دمشق میں لاکر آزاد کر دیا گیا، اگلے سال ۵۷۶ھ ۱۱۸۰ء میں سلطان نے مصر میں ایک بڑی بحری فوج تیار کی اور بلدوین سے مقابلہ کے لئے نکلا، بلدوین کو یہ خیال آیا کہ وہ سلطان کے مقابلہ میں ایک مرتبہ پسپا ہو چکا ہے، لہذا دو سال کے لئے صلح کی پیش کش کی سلطان نے اس کو قبول کیا، اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر امراء سلاجقہ قلج ارسلان والی قونیہ، عزالدین مسعود والی موصل کی سرکوبی کا ارادہ کیا تا کہ داخلی خطرہ سے سلطان بے فکر ہو جائے لیکن ان تمام امراء نے بغیر جنگ کے سلطان کی طاعت قبول کی۔ سلطان ۱۰ر شعبان ۵۷۶ھ دمشق سے مصر لوٹ آیا، مصر میں تقریبا ڈیڑھ سال قیام کیا۔ اس دوران ملکی معاملات کی جانب توجہ دی ملک مصر کو چہار جانب سے مضبوط کیا، دمیاط کی جانب سے شہر پناہ کو درست کرایا، قلعہ تنیس کی مرمت کرائی، فوجی طاقت اور جنگی وسائل کو مزید بڑھایا، ۵۷۷ء جون ۱۱۸۱ء میں قسطنطنیہ کے شہنشاہ الکسیوس کومنینوس کی جانب سے سفارت آئی، سلطان اور قیصر کے درمیان معاہدہ صلح قائم ہوا، اس معاہدہ کے ذریعہ بہت سے مسلمان قیدیوں کو آزاد کرایا گیا، صلاح الدین اس دوران ایک ایسے حملے کی تیاری میں تھا جس سے صلیبی طاقتیں چکنا چور ہو جائیں، اور دوبارہ جلدی اٹھنے کی کوشش نہ کر سکیں، اچانک یہ خبر عام ہوئی کہ اسماعیل بن نور الدین والی حلب کا انتقال ہو گیا، اس کا جانشین چچازاد بھائی عز الدین مسعود ہوا، سلطان نے مقصد کی تکمیل کے لئے اپنا کام شروع کیا، اپنے نائبان کو محرم ۵۷۸ھ ۱۱ر مئی ۱۱۸۲ء میں شام سے نکلنے کا فرمان جاری کیا، اور خود بھی مصر سے نکلنے کی تیاری کی، سلطان ریلہ کے راستہ سے چند ہفتوں میں دمشق پہونچ گیا وہاں سے حلب کا رخ کیا، نہر فرات کو پار کرتے ہوئے مشرق میں اپنا قدم رکھا، سلطان کا ارادہ تھا کہ اس حملہ میں پورے جزیرہ کو اپنے زیر سایہ لے تا کہ شمال کی جانب سے کوئی خطرہ نہ رہے، الرھا، حران الرقہ، نصیبین، سنجار پر قبضہ کی کوشش کی، موصل کا محاصرہ لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ملی، امد کا ارادہ کیا اس پر قبضہ کر لیا، پھر سلطان نہر فرات کو پار کرتے ہوئے حلب

پہونچا، وہاں کچھ حالات ایسے بنے کہ معاہدہ صلح قائم ہوا، ۳؍ سال کے بعد ۵۸۱ھ ۱۱۸۵ء میں موصل کو اپنے قبضہ میں لیا، اگلے سال ۱۱۸۶ء میں دیار بکر کو فتح کیا اس طرح پورے جزیرے کو فتح کرنے کا مقصد پورا ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ شمالی محاذ تمام خطروں سے محفوظ ہو گیا۔

صلیبی اپنی دشمنانہ روش پر پوری طرح قائم تھے، ایک صلیبی حکمراں دیودی شامیون والی کرک کی گستاخ جرات تو یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ اس نے حجاج کا راستہ بند کرنے کے لئے بری اور بحری حملہ کی تیاری کی، اپنی کشتیوں کو بحر احمر کے جنوبی علاقہ عیذاب تک لے آیا، اس صلیبی لیڈر کا ارادہ جنوب وحجاز میں غارتگری کرنا، قبر رسول کو ضرر پہونچانا اور پھر کعبہ کا انہدام تھا، ایک موقعہ سے حجاج پر دھوکہ سے حملہ کیا، بہت سے لوگوں کو قید کیا، ان کی کشتیاں جلا ڈالیں، مصر میں سلطان کا نائب اور فرزند نے ان صلیبیوں کو سبق سکھانے کی غرض سے بحری راستہ سے سخت حملہ کیا، صلیبی کشتیوں کے پرخچے اڑا دیئے، بہت سارے مسلمانوں کو آزاد کرایا، اور اسی طرح بری فوج کو بھی بری طرح شکست فاش دی، صلیبیوں کی ایک بری تعداد کو گرفتار کر کے قاہرہ لایا اور سب کو قتل کر دیا، یہ واقعہ اپریل ۱۱۸۳ء کا ہے۔

سلطان صلاح الدین نے صلیبیوں پر مسلسل اپنے حملوں کو جاری رکھا اور کرک کے مضبوط قلعہ پر حملہ کا ارادہ کیا تا کہ وہاں کے حاکم کو اس کی بغاوت وجرأت کی سزا دے، قلعہ کا محاصرہ کیا اور توپ سے اس پر حملہ کیا بہر حال دونوں جانب سے صلح ہوئی اور تقریباً ۱۱۸۴ء تک یہ صلح باقی رہی۔

لیکن یہ خائن وغدار حاکم اپنی شریر طبیعت سے باز نہ آیا، تمام عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی پر اتر آیا، اپنے جاسوس چہار جانب دوڑا دیئے اور ایسے موقع کی تلاش میں رہنے لگا جس میں مسلمانوں کو نقصان پہونچایا جا سکے، مسلمان تجاروں کے ایک قافلہ پر حملہ کیا جو اس کے قلعہ کے پاس سے گزر رہا تھا ان کا مال لوٹ لیا، سلطان کو جب اس کی خبر ہوئی تو سلطان نے قسم کھائی کہ اگر یہ غدار میرے ہاتھ لگا تو اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔

حطین کی جنگ

سلطان نے صلیبیوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا ارادہ کیا، ایک بڑی فوج جمع کرنے کے لئے اپنے کارندے مصر شام کے تمام علاقوں میں دوڑا دیئے، ۵۸۳ھ اپریل ۱۱۸۷ء میں سلطان اپنی فوج کو لے کر دمشق سے بصرہ کی جانب نکلا، اسی دوران سلطان کو یہ خبر ملی کہ حجاج کی حجاز سے واپسی پر ان کو مشکلات میں ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور یہ کہ مصر سے سلطان کے لئے کمک کے طور پر صلیبی لشکر نے طبریہ میں ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا جہاں پانی کی سہولت تھی تو اسی جانب کوچ کیا، سلطان کی فوج نے ان کا راستہ روکا، ایک خونریز معرکہ ہوا، مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، صلیبیوں کو اپنے محاصرہ میں لینا شروع کر دیا، اس کا راستہ روکنے کا ارادہ رکھتا تھا، چند روز کے بعد یہ خبر ملی کے حجاج کا قافلہ رینو کی کے مکر سے بچ کر نکل گیا ہے، اب سلطان نے کرک وشویک کا رخ کیا، اس دوران مصری فوج عادل کی قیادت میں آپلہ کے راستہ سے سلطان سے آملیں، شام اور جزیرہ کی فوج سلطان کے لڑکے ملک الافضل کی قیادت میں دمشق میں جمع ہو رہی تھیں، سلطان کے حکم سے اس لشکر نے عکا کی سرحد پر ایک پرزور حملہ کیا، جس میں صلیبیوں نے بری طرح شکست کھائی شہسواروں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا گیا، سلطان عکا کے علاقہ میں داخل ہوا، بہت سارے قیدی اور مال غنیمت ہاتھ آیا اور یہیں پر سلطان اور اس کے بیٹے ملک الافضل ایک بڑے لشکر کی شکل میں جمع

ہوئے، اس طرح اسلامی لشکر کی تعداد ۱۲ ہزار شہسواروں اور رضا کاروں کی تھی، سلطان اب اپنی فوج کو لے کر جنوب میں طبریہ کی جانب بڑھا، طبریہ میں قلعہ کا محاصرہ کیا، سلطان چاہتا تھا کہ یہ لوگ قلعہ سے باہر آ کر مقابلہ کریں لیکن وہ لوگ قلعہ بند رہے، آخر میں سلطان نے محاصرہ ختم کیا اور طبریہ سے قریب اپنی چھاؤنی میں لوٹ آیا، طبریہ کے عیسائی قلعہ سے نکل کر نشیبی علاقہ میں جمع ہو گئے اور وہاں کے تمام پانی کے چشموں کو خراب کر دیا۔ ۲۴ ربیع الاول ۵۸۳ھ ۴ جولائی ۱۱۸۷ء میں مسلم فوج پورے جوش کے ساتھ صلیبیوں کی جانب بڑھی، اس وقت صلیبی فوج کی تعداد پچاس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی، اس فوج کی قیادت جی دی لوستیاں بیت المقدس کا بادشاہ کر رہا تھا، نیز رینودی شاتیون والی کرک، کونت ایمون والی طرابلس اس کے علاوہ اور بہت سے صلیبی شاہ اس میں شامل تھے، صلیبیوں نے یہ پلان بنایا کہ اسلامی لشکر کو طبریہ میں داخل ہونے سے روکا جائے صلیبی لشکر نے طبریہ میں ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا، جہاں پانی کی سہولت تھی اس جانب کوچ کیا، سلطان کی فوج نے انکا راستہ روکا، ایک خونریز معرکہ ہوا، مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، صلیبیوں کو اپنے محاصرہ میں لینا شروع کر دیا، کچھ صلیبی ایک قریبی گاؤں حطین کا رخ کرتے ہوئے بھاگے، وہاں جا کر اپنی طاقت کو یکجا کیا وہاں بھی مسلمانوں نے پیچھا کیا اور سخت رن پڑا، مسلمانوں کے کئی مرتبہ قدم اکھڑے، لیکن آخر میں صلیبی بری طرح شکست سے دو چار ہوئے، مسلمان ان کے خیموں پر قابض ہو گئے، سب سے بڑے خیمہ صلیب الصلیوت کو اپنے قبضہ میں لیا جس کے تعلق سے عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو اسی لکڑی پر سولی دی گئی ہے، تمام بڑے سرداران کو قید کر لیا گیا، خاص طور سے بیت المقدس کا شہنشاہ رینودی ساتیون، ان تمام امراء کو سلطان کے خیمہ میں لایا گیا، سلطان نے رینودی ساتیون کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جس نے مسلمانوں کے تجار قافلہ کو لوٹا تھا، صلاح الدین نے اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی نذر مانی تھی، سلطان نے اس کی غداری اور قبر رسول گو ایذا پہونچانے میں کوشش کرنے کے جرم میں اس کو قتل کر دیا، تاریخ میں یہ جنگ جنگ حطین کے نام سے مشہور ہے، یہ ایک ایسا معرکہ تھا جس نے صلیبی طاقتوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا، اب سلطان نے طبریہ کا رخ کیا، پورے امن و امان کے ساتھ وہاں کے قلعہ پر قابض ہوا، پھر عکا کا رخ کیا، وہاں کے باشندوں کو امان دیا سلطان نے وہاں کا والی اپنے بیٹے ملک المفضل کو بنایا، مسلمان قریبی شہروں پر قابض ہوتے چلے گئے جیسے الناصر، قساریۃ، حیفا، صقوریہ، سلطان نے شمال کی جانب بیش قدمی کی اور صیدا پر قبضہ کیا اس کے بعد بیروت کا رخ کیا یہ تمام فتوحات ایک مہینہ سے بھی کم مدت میں تکمیل کو پہونچیں۔

عظیم الشان فتح بیت المقدس

سلطان نے بیت المقدس کی بازیافت کے لئے پے در پے حملہ کئے، ان حملوں سے صلیبی مملکت کے دانت کھٹے ہو گئے، سلطان کا خیال تھا کہ حطین کی جنگ نے صلیبی طاقتوں کے حوصلہ پست کر دئے ہیں، اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے سلطان نے اپنے اصل مقصد کی جانب پیش رفت کی، اپنی فوج کو لے کر عسقلان کی جانب بڑھا، عسقلان پہونچ کر اکثر و بیشتر مضبوط قلعوں پر قبضہ کیا، وہاں سے فلسطین کا رخ کیا، مصر کے جہازی بیڑہ کو نہر فرات کے ذریعہ فلسطین کا رخ کرنے کا حکم دیا، بحری بادشاہ کہے جانے والے حسام الدین لولو الحاجب نے مصری بیڑہ کو نہر فرات میں ڈال دیا، اور تمام صلیبی کشتیوں کا

راستہ قرب ساحل پر ہی روک لیا۔

سلطان اپنے لشکر کو لے کر ۱۵/ رجب ۵۸۳ھ ۲۰ ستمبر ۱۱۸۷ء بیت المقدس کے قریب ہوا، ادھر صلیبی فوجیں ان شہروں سے آکر یکجا ہوگئیں جن کو سلطان نے فتح کرلیا تھا، ان فوجوں نے بیت المقدس کے دفاع میں اور سلطان کے داخلہ کو روکنے میں آخری حد تک کوشش کی۔

سلطان نے پورے شہر کو اپنے حصار میں لیا، اور توپ سے حملہ کیا، صلیبی فرنگیوں نے بھی مسلمانوں پر اوپر سے توپ کے ذریعہ گولے برسائے، چند ہی لمحوں کے بعد صلیبی شہسوار قلعہ سے باہر نکل آئے اور سخت معرکہ ہوا۔ سلطان کی فوج بڑے حوصلہ کے ساتھ لڑتی رہی یہاں تک کہ قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیا، صلیبی فوج نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سلطان سے امان طلب کی، سلطان نے اس پیغام کو ٹھکرا دیا، اور ان کو وہ سفا کی یاد دلائی جو ان کے آباء واجداد نے بیت المقدس میں داخلہ کے وقت مچائی تھی، وہ خونریزی یاد دلائی جس کی شہادت بیت المقدس کے در و دیوار دے رہے تھے، اس وقت صلیبی فوج کا کمانڈر بالیاں بذات خود سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلطان کو اس بات کی دھمکی دی کہ اگر عیسائیوں کو امان نہ دی گئی تو بہت جلد وہ بچوں اور عورتوں پر حملہ کریں گے، قبۃ الصخراء اور بیت المقدس کو ضرر پہونچائیں گے، ان ہزاروں مسلمانوں کو قتل کریں گے جو ان کی قید میں ہیں، سلطان نے مشورہ کے بعد ان کو امان بخشی، اور اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ صلیبی شہر سلطان کے سپرد کردیں، مزید تمام عیسائی اپنے مکانوں میں پر امن طریقہ سے منتقل ہوجائیں، اور ہر شخص چالیس دن کے اندر اپنا فدیہ دے کر آزاد ہوجائے، فدیہ ہر مرد پر دس دینار ہر عورت پر پانچ دینار، اور ہر بچہ، بچی پر دو دینار طے ہوا۔

۲۷/ رجب بروز جمعہ ۵۸۳ھ میں مسلمان بیت المقدس میں داخل ہوئے بیت المقدس کے بام و در پر اسلامی پرچم لہرادئے گئے، قبۃ الصخراء سے صلیب کو اتارا گیا، مسجد اقصی اور قبۃ الصخراء کو ھیکل وصلیب سے خالی کردیا گیا، سلطان نے فدیہ لینے میں آخری درجہ تک نرمی سے کام لیا، بہت سے امراء کو مع اپنے حاشیہ برداروں کے ساتھ بغیر فدیہ کے کوچ کرنے کی اجازت دی بلکہ بہت سے امیروں کو تحائف سے بھی نوازا۔

مؤرخ ابن اثیر کا کہنا ہے، جس وقت عیسائیوں نے بیت المقدس مسلمانوں کے حوالہ کیا ہے اس وقت ساٹھ ہزار عیسائیوں کو سلطان نے معاف کیا، عماد اصفہانی جو کہ سلطان کے کاتب خاص تھے سلطان کی مجلس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں، سلطان اپنی مجلس میں بیٹھتے، امراء حکماء، علماء وصوفیہ ملاقات کے لئے آتے، سلطان کی ذات علماء اور فقہاء کے درمیان متواضع اور پروقار نظر آتی، آپ کا چہرہ انسانی شرافت کے نور سے چمکتا ہوتا۔

سلطان کی وفات

اب سلطان کا ارادہ فریضہ حج کی ادائیگی کا تھا مگر اسی دوران وہ بیمار ہوگئے، مرض اتنا شدید تھا کہ طبیعت اب کسی چیز کی اجازت نہیں دی تھی، دس شعبان ۵۸۸ھ میں دمشق کا سفر کیا، طبیعت کچھ زیادہ خراب رہی، بہر حال اسلام کے اس عظیم سپوت نے صفر ۵۸۹ھ ۴/ مارچ ۱۱۹۳ء کو ۵۷ سال کی عمر میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

یہ وہی عظیم فاتح ہے جو تقریبا پچاس سال تک میدان جنگ کی پرخطر وادیوں کا سفر کرتا رہا، اور اپنی زندگی ممالک اسلامیہ کی حفاظت، بیت المقدس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں قربان کردی۔

☆☆☆

سیرت وسوانح

حضرت عمر فاروقؓ کی رواداری

ظفر دارک قاسمی
ریسرچ اسکالر، شعبہ سنی دینیات، اے ایم یو علی گڑھ

ایک نظریاتی حکومت میں ان لوگوں کے لئے جگہ نہیں ہوا کرتی جو اس نظریئے کے دل سے مخالف ہوں اور ہر وقت کاٹ میں لگے رہتے ہوں... ایسے لوگوں کو گوارا کرنا مستقبل کے فتنوں کو دعوت دینا ہے لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی حسن سلوک روا رکھا... ان کے مال کی حفاظت کی' ان کی جان کی حفاظت کی' ان کے مذہب کی حفاظت کی' ان کی تہذیب وتمدن کی حفاظت کی' ان کے غریبوں اور ضعیفوں کی کفالت کی' ان کے دشمنوں سے مقابلہ کیا... غرض وہ کچھ کیا جو اس ترقی یافتہ دور میں بھی نہیں کیا جاسکتا... اس ترقی یافتہ دور میں نظریاتی حکومتوں میں حکومت سے اختلاف رکھنے والا قابل گردن زدنی' سوختنی اور کشتنی ہے... مگر عہد فاروقی میں رواداری نظر آتی ہے اس لیے انگریز مصنف ڈبلیو منٹگمری واٹ عہد فاروقی میں مسلمانوں کی وسعت قلبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے

''(ذمیوں کی) اس سرکشی اور خودرائی کے باوجود (جو مسلمانوں کی نظر میں سرکشی وخودرائی ہی تھی) سلطنت اسلامیہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ذمی کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے مسلمان تیار تھے اور یہ تسلیم کرتے تھے کہ ان یہود ونصاریٰ کی موجودگی سلطنت کی مذہبی اساس سے بالکل متصادم نہیں۔

ہم پرانی شراب کو نئے پیمانے سے ناپتے ہیں لیکن اصول تنقید یہ ہے کہ پرانی شراب کو پرانے پیمانے سے ہی ناپا جائے... اگر ایسا کیا گیا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا حسن سلوک' ظلم واستبداد اور تعصب وتنگ دلی کی موجودہ فضاؤں میں آفتاب عالم تاب کی طرح چمکتا نظر آئے گا... اغیار کی جفا کاریوں کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اسلام کی اس چاندنی کا چھٹکنا دیکھو''!

عہد وپیماں کی پاسداری' انسان کی شرافت وصداقت شعاری کا معیار ہے... جو شخص معمولی سے معمولی عہد وپیماں کا پاس لحاظ رکھتا ہے بلاشبہ وہ گلشن شرافت کا گل سرسبد اور دیار صداقت کا تاجدار ہے... فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اغیار سے کئے گئے عہد وپیمان کا جو پاس ولحاظ رکھا شاید ہی کسی نے رکھا ہو... آج کل دوستوں سے کئے گئے عہد وپیماں کا خیال نہیں رکھا جاتا تو اغیار سے کئے گئے عہد وپیماں کا کہاں خیال رکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ دور جدید میں تو عہد شکنی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہے... لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دامن صداقت عہد شکنی کے داغ سے داغدار نہیں... دیکھو دیکھو رئیس خوزستان (ایران) ہرمز، دربار فاروقی رضی اللہ عنہ میں قید ہوکر آیا ہے، قابل گردن زدنی ہے کہ اس نے بہت سے مسلمان افسروں کو شہید کیا ہے' قتل کا مصمم ارادہ ہے' اچانک وہ پانی مانگتا ہے اور پانی پینے تک کی امان طلب کرتا ہے' امان دی جاتی ہے لیکن وہ پانی نہیں پیتا' رکھ دیتا ہے یا پھینک دیتا ہے' حاضرین ہکا بکا رہ جاتے ہیں' اگر کوئی اور ہوتا تو دشمن کی اس حرکت سے اور طیش میں آجاتا'

لیکن نہیں نہیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ہاتھ روک لیا۔ عہد و پیماں کی اس پاسداری کو دیکھ کر ہرمزحیران رہ گیا اور اسی وقت مسلمان ہوگیا۔

جب غالب' مغلوب سے معاہدہ کرتا ہے تو خواہ ایک ہی دین و ملت کے کیوں نہ ہوں لیکن ہمیشہ غالب اپنی بات اوپر رکھتا ہے اور اگر کسی مصلحت وحکمت کی وجہ سے بات نیچی رکھتا بھی ہے تو پھر عمل نہیں کرتا' وہ معاہدہ ایک افسانہ بن کر رہ جاتا ہے' دور جدید کی سیاست میں آئے دن یہ نظائر سامنے آتے رہتے ہیں لیکن دیکھو دیکھو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو دیکھو' سرزمین قدس میں ایک خادم ساتھ لئے چلتے آرہے ہیں' وہ خلیفۃ المسلمین ہیں لیکن فقیرانہ آرہے ہیں... ان کی سادگی نے شاہوں کے تکلفات خاک میں ملا کر رکھ دیئے... اور دیکھو بیت المقدس کے مغلوب عیسائیوں سے ایک معاہدہ کیا جارہا ہے... شاید تاریخ عالم اس معاہدے کی نظیر نہ پیش کر سکے۔ ۶۳۶/۵۱ء میں یہ معاہدہ لکھا گیا... حضرت خالد بن ولید' حضرت عمرو بن العاص' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس پر گواہ ہیں۔ ذرا اس معاہدے کی تمہید تو ملاحظہ ہو۔

''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمر نے ایلیاء (بیت المقدس) کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کے جان و مال' گرجا' صلیب' تندرست' بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لئے ہے''

اور اب اس معاہدے کی تفصیلی دفعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی اور نہ وہ ڈھائے جائیں گے' نہ ان کو اور نہ ان کے احاطے کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

۲۔نہ ان کی صلیبوں اور نہ ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔

۳۔مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا۔

۴۔نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

۵۔یونانیوں میں جو شہر سے نکلے گا اس کی جان و مال کو امان ہے تا آنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے اور جو ایلیا (بیت المقدس) میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امان ہے اور اس کو جزیہ دینا ہوگا۔

ٹی ڈبلیو آرنلڈ (Arnold T.W.) نے اس معاہدے کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترجمہ: اس رواداری کی رفعت و بلندی کا اندازہ ان شرائط سے لگایا جاسکتا ہے جو مفتوحہ شہروں کے لئے منظور کی گئیں... یہ رواداری ساتویں صدی عیسوی میں نہایت حیرت ناک اور قابل توجہ ہے۔

معاہدے کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں داخل ہوئے... ایک پادری کے ساتھ ایک گرجا میں تشریف لے گئے کہ نماز کا وقت آپہنچا' پادری نے عرض کیا کہ گرجا میں ہی نماز ادا فرمالیں لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے وہاں نماز ادا نہ فرمائی کہ مبادا مسلمان اس گرجا کو مسجد بنالیں کہ امیر المومنین نے یہاں نماز ادا فرمائی ہے... اللہ اللہ یہ حزم واحتیاط اور معاہدین کے ساتھ یہ حسن سلوک!

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مذہبی تعصب و تنگ دلی کے اس دور میں وہ مذہبی آزادی دی کہ شاید اس ترقی یافتہ دور میں بھی میسر نہ ہو... عہد فاروقی کے تمام معاہدات اٹھا کر دیکھ لیجئے' مذہبی آزادی کی ضمانت نمایاں نظر آتی ہے... جرجان' آزربائیجان' موقان کے باشندوں سے جو معاہدات کئے گئے وہاں مذہبی آزادی کی ضمانت موجود ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا آزادی ہوگی کہ ان کے معابد میں خود نماز پڑھنے سے احتراز کیا جائے۔

جو شخص مذہبی آزادی کے معاملے میں اتنا روشن خیال ہو' کہ وہ اپنے غلام استثقیق سے بھی باز پرس نہ کرے' صرف ترغیب وتشویش سے کام لے' جب وہ نہ مانے تو آیت قرآنی پڑھ کر خاموش ہوجائے... لا اکراہ فی الدین ... بھلا دوسروں سے مذہب کے معاملے میں کیا باز پرس کرتا!

ٹی پی ہیوز (HughsT.p.) نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے بنوتغلب کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب

انہوں نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور آپ نے تبدیلی مذہب پر ان کو مجبور کرنا چاہا تو دربار خلافت سے یہ فرمان جاری ہوا۔

ترجمہ: آپ نے تحریر فرمایا کہ ''ان کو دین عیسوی پر ہی رہنے دو''

مصر کی مکمل فتح کے بعد بہت سے قبطی اور رومی گرفتار ہو کر آئے' فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فاروق اعظم سے استفسار فرمایا تو جواب آیا:

''سب کو بلا کر کہہ دو کہ ان کو اختیار ہے' مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر ہی رہیں۔ اسلام قبول کر لیں تو ان کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں ورنہ جزیہ دینا ہوگا جو تمام ذمیوں سے لیا جاتا ہے''

دور جدید کے مورخ فلپ کے ہٹی نے اگرچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے معاملے میں زیادہ انصاف سے کام نہیں لیا لیکن یہ اعتراف کہ عہد مبارک میں غیر مسلموں کو بالکل مذہبی آزادی حاصل تھی' اس نے بھی کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

ترجمہ: قانون اسلامی کے دائرہ سے باہر ہونے کی وجہ سے ذمیوں کو اپنے مذہبی فرقوں کے مقدمات فیصل کرنے کا عدالتی اختیار حاصل تھا۔

مشہور شیعہ مورخ امیر علی نے بھی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس رواداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

مسلمانوں کو حکما لوگوں کے دین میں مداخلت سے روک دیا گیا۔

ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رواداری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترجمہ: ذمیوں کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی بلا روک ٹوک کھلی اجازت تھی۔

معاہدین کے علاوہ وہ غیر مسلم جنہوں نے برضا و رغبت خلافت اسلامی میں رعیت کی حیثیت سے رہنا قبول کیا' یعنی ذمی' ان کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا' ان کو جو خصوصی رعایات دی گئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلافت فاروقی میں غیر مسلموں کو کیا عزت و وقار حاصل تھا' شاید یہ عزت و وقار خود مسلمانوں کو کسی مسلم حکومت میں بھی حاصل نہ ہو۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عالی حوصلگی' دریا دلی اور بے مثالی رواداری نے مسلم اور غیر مسلم رعیت کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا کہ حقوق کے حوالے سے دونوں بڑی حد تک مساوی ہو گئے۔ ذمیوں کے لئے مندرجہ ذیل اصول و قوانین پیش نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ مساوی تھے یا نہیں۔

مسلمان کسی ذمی کو قتل کرتا تھا تو قصاص میں اسے قتل کیا جاتا۔ چنانچہ بقول حضرت امام شافع ایک مرتبہ ایک مسلمان نے عیسائی کو قتل کر دیا' یہ مقدمہ خلیفہ کے پاس پیش کیا گیا۔ آپ نے مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا کہ وہ قاتل سے قصاص لیں، چنانچہ قاتل قصاص میں قتل کیا گیا۔

دور جدید میں غیر مسلم رعایا کا کیا پوچھنا اگر مسلمان ہی اپنے بھائی کو قتل کرتا ہے تو اس کا کوئی پرسان حال نہیں... پھر سچ بتائیے' امن و سلامتی خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ میں تھی یا جدید حکومتوں میں ہے؟

ذمی پر کسی مسلمان کا ظلم و ستم کرنا تو بڑی بات تھی اگر وہ سخت کلامی بھی کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا... اور سزا تو بعد میں ملتی' مسلمان افسران خود اس کا خیال رکھتے کہ یہ نوبت نہ آنے پائے... چنانچہ حاکم حمص (شام) حضرت عمر بن سعد رضی اللہ عنہ نے غصے میں ایک ذمی کو صرف اتنا کہا...

"اخزاك الله" (خدا تجھے رسوا کرے)... حاکم موصوف کو اس حرکت پر اتنی ندامت ہوئی کہ دربار خلافت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

یہ تابناک مثال سامنے رکھئے اور اپنی حالت پر غور کیجئے۔ غیر تو غیر اپنوں کے لئے وہ گالیاں' دشنام طرازیاں اور ستم رانیاں کہ الامان والحفیظ... یہ ہماری حالت ہے اور وہ ان کی حالت تھی... وہ اخلاق کی کس بلندی پر تھے اور ہم کس پستی میں ہیں۔

☆☆☆

دل کی آواز

وقت کیا چاہتا ہے؟

فرید حبیب ندوی
استاد: مدرسۃ العلوم الاسلامیۃ، علی گڑھ

انسان جن مشکلات ومصائب سے دوچار ہوتا ہے اس میں اس کی بداعمالیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے، وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم ، سمجھدار اور عقل مند انسان ایک ہی ٹھوکر سے صحیح رخ پر آجاتا ہے اور بے حس اور نادان بار بار مصیبتوں کے گڑھے میں گرتا رہتا ہے۔

مسلمان اس وقت جن پریشانیوں اور مشکلات سے دوچار ہیں اس میں ان کی بداعمالیوں، بدکرداریوں اور نافرمانیوں کا بھی بڑا رول ہے، کتنے کام تھے جو ہم مسلمانوں کو کرنے تھے مگر ہم آج تک ان کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے، اور کتنے کام تھے جن سے ہمیں اجتناب کرنا تھا مگر ہم ان میں پہلے سے زیادہ ملوث ہوتے جارہے ہیں، مرض کو دور کرنے اور درد کا درماں کرنے کے جو اسباب ہمارے پاس تھے ان سے پہلوتہی کئے بیٹھے ہیں، مرض کچھ ہے علاج کچھ کیا جارہا ہے، درد کہیں ہے دوا کہیں اور لگائی جارہی ہے، ناسور کہیں ہے نشتر کہیں لگایا جارہا ہے۔

ہمارے ملک میں مسلمانوں کی حالت کو مستحکم کرنے کی جو کوششیں ہورہی ہیں وہ یقیناً بڑی مبارک ہیں مگر جیسا کہ لوگوں کا احساس ہے وہ پوری طرح ثمر آور نہیں ہو پارہی ہیں۔اس کی شاید سب سے بڑی وجہ (مذکورہ برائیوں کے ساتھ ساتھ) مسلم قیادت کا فقدان ہے۔

مسلم قیادت کے فقدان سے مراد یہ نہیں کہ مسلمانوں کے پاس کوئی قائد نہیں ہے، ہمارے یہاں قائدین کی کوئی کمی نہیں، الحمدللہ قیادت کی صلاحیت رکھنے والے بے شمار لوگ ہیں، اور بہت سے قیادت کے فریضہ کو انجام بھی دے رہے ہیں، ان میں ضلعی سطح کے بھی قائد ہیں، صوبائی سطح کے بھی اور ملکی وعالمی سطح کے بھی، جن کی بات سنی جاتی ہے، ان کی گفتگو پر کان لگائے جاتے ہیں، اور دشمن ان کی زبان کو تلوار سمجھ کر لرزہ براندام بھی ہو جاتے ہیں اور انہیں خاموش کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں، بلکہ اس سے مراد متحدہ قیادت کا فقدان ہے۔

ہم مسلمانوں کی دو ایک تنظیمیں ایسی بھی ہیں کہ اگر وہ کسی بات کا بیڑہ اٹھالیں تو مسلم اکثریت ان کی طرفدار ہوگی، مگر یہ بات ابھی بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر ان کی طرف سے اس جانب پیش رفت کیوں نہیں ہوتی، مسئلہ یہ نہیں کہ وہ تنظیمیں سیاسی

ہیں یا غیر سیاسی (مذہبی)، اس سے بھی قطع نظر کہ سیاسی اور غیر سیاسی کی تقسیم ہی بے معنی اور غلط ہے سوچنے کی اور عمل کرنے کی بات یہ ہے کہ ٹھیک ہے اگر ہمارے بعض بزرگوں کے نزدیک موجودہ صورتحال میں سیاست میں حصہ لینا ٹھیک نہیں (جیسا کہ بعض بزرگوں کی مبارک رائے ہے) تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ عملاً حصہ نہ سہی، الیکشن کے موقع پر مسلم عوام کے ذہنوں کو کسی ایک طرف موڑا جاسکتا ہے۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ اگر ہمارے ان معتبر بزرگوں کی اتفاق رائے سے کسی ایک پر اتفاق کر کے مسلم عوام کے رخ کو ادھر موڑ دیا جائے تو سب نہ سہی مگر اکثریت ان کی ہمنوا ضرور ثابت ہوگی۔

ہم جلسے جلوس اور کانفرنس تو روز کرتے ہیں، اور معاف کیا جائے بات ذرا تلخ ہے کہ ہر روز اخبارات میں کسی نہ کسی بڑی کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوتی ہی رہتی ہے، تجاویز بھی پیش کی جاتی ہیں، اور بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، مسلمانوں کو کسی کا ڈر نہیں، مسلم قیدیوں کو رہا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، جیسے نعرے ہماری طرف سے آئے دن بلند ہوتے رہتے ہیں، مگر کیا یہ آواز صدا بصحراء نہیں ثابت ہوتی؟ کیا اس میں اتنی قوت ہوتی ہے جو ایوان حکومت کو متزلزل کر سکے؟ کیا اس طرح ہم آج تک اپنے مطالبات منوا سکے ہیں؟ اگر کہیں اکا دکا کوئی فیصلہ ہمارے حق میں ہو بھی جاتا ہے تو اگلے ہی چند دنوں میں ایسا کوئی حادثہ پھر پیدا کر دیا جاتا ہے جو زخم پر مرہم کے بجائے نمک چھڑکنے کا کام کرتا ہے۔

تلخ نوائی کے لئے معافی!! ایک طرف یہ حالات ہیں، یہ ضروریات اور تقاضے ہیں اور دوسری طرف ہماری خوش فہمی اور تنگ ذہنی کا یہ حال ہے کہ اگر ہم میں سے کسی کو کوئی عہدہ یا کوئی ایوارڈ مل جاتا ہے تو ہفتوں اس پر مبارکباد کے سلسلے جاری رہتے ہیں؟ ہزاروں روپے کے اشتہارات محض مبارکباد دینے پر بے دریغ خرچ کر دئے جاتے ہیں؟؟ ہر ایک اپنی دنیا میں مگن اور خود میں مست نظر آتا ہے، عمومی مفاد یا ملت کا مفاد سوائے چند کے اکثروں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

ہمارے قائدین اور ہمارے بزرگ ہمارے لئے رہنما ہیں، ہمیں جدھر کا رخ دکھائیں گے ہمارا سفر اسی منزل کی طرف جاری ہو جائے گا، لیکن کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ رخ کی تعیین کر دی جائے؟؟

مسلم قیادت اس وقت ہر دل کی پکار، ہر قلب کی تمنا، بلکہ ہر دل کی دھڑکن ہے، ایسا نہیں کہ ہمارے پاس قیادت نہیں ہے، قیادت تو ہے بلکہ قیادت کی فراوانی ہے....

مگر مسلم قیادت کی فراوانی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ منظم نہیں ہے۔ مسلم قیادت تو ہے مگر متحدہ قیادت کی ضرورت ہے، بکھری ہوئی قیادت کے انضباط کی ضرورت ہے، منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کے لئے نفس پر بڑا سخت دباؤ ڈالنا ہوگا، مگر اپنے بزرگ قائدین کے اخلاص کے پیش نظر امید بلکہ قوی یقین ہے کہ خودغرضی اور شہرت طلبی کو آڑے نہ آنے دیا جائے گا۔

اگر کسی ایک شخص کی قیادت پر اتفاق ممکن نہ سمجھا جائے تو دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چند ذمہ دار قائدین کی ایک ٹیم مجلس قیادت یا مجلس شوری کے نام سے بنالی جائے جس میں ملک کے

بڑے بڑے چار پانچ قائدین ہوں، اور پھر ہندوستان میں تمام سیاسی فیصلے انہی کے آراء وافکار کے مطابق کئے جائیں۔ (ضروری نہیں کہ نئی تنظیم ہی بنائی جائے، مذکورہ شکل میں کسی پرانی تنظیم کی بھی تجدید کی جاسکتی ہے۔)

بہتر یہ ہے کہ اس مجلس شوری میں ہر مسلک ومکتب فکر کے ایک نمائندہ کو شریک کیا جائے، تقریباً ہر مسلک والے اپنے اپنے مسلک ومکتب فکر کی حدود میں کسی نہ کسی شخصیت کی مرجعیت پر متفق ہوتے ہیں، اسی مرجع شخصیت کو مجلس شوری میں شامل کرلیا جائے، اس طرح کسی کو اعتراض بھی نہ ہوگا اور تمام مسلمان عوام ہوں چاہے خواص اس سے راضی ہو جائیں گے، اس کی صورت بالکل ویسے ہی سمجھئے جیسے حضور پاک علیہ السلام نے ہر قبیلہ سے ایک نمائندہ لے کر حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کرایا تھا۔

کیا ہمارے قائدین اس آواز پر توجہ دیں گے؟ کیا اس پکار پر لبیک کہیں گے؟؟ یہ تو نہیں معلوم، مگر لگتا یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں ہمارے قائدین کو بھی متحدہ قیادت کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے، اگر چہ ابھی وہ بآواز بلند اس کا اظہار نہیں کر پا رہے ہیں، لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ مخفی آواز ہر زبان کا نعرہ بن جائے گی۔

حالات کی ستم ظریفی چیخ چیخ کر مسلمانوں کو اس جانب متوجہ کر رہی ہے، آزادی کے بعد کا تقریباً ستر سالہ یہ دور بلکہ اس کا ایک ایک دن مسلمانوں کو ان کی سیاسی قیادت کی کمی وبے توجہی کے کچوکے لگا رہا ہے، اس طویل دور میں مسلمانوں نے کیا کچھ نہ سہا ظلم کی کون سی قسم ہے جو ان پر روانہ رکھی گئی مگر ہم صرف دوسروں کے سہارے جینے کی ناکام کوشش کرتے رہے، اور ہماری اکثریت آج بھی اس دام فریب سے نکلنے کو تیار نہیں۔

مسلمانوں کو دونوں اعتبار سے تیاری کرنے کی ضرورت ہے، روحانی اور باطنی تیاری بھی، اور ظاہری ومادی تیاری بھی۔

یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں، محض ایک کے اختیار کرنے سے اور دوسری چیز کو تشنہ چھوڑ دینے سے مسلمان اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔

دونوں میں فرق صرف اس اعتبار سے ہے کہ اول الذکر تیاری کو انفرادی اعتبار سے پختہ سے پختہ تر کرنے پر توجہ دینے کی اور ثانی الذکر کو اجتماعی طور پر مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش ہونی چاہیے۔

ابھی وقت نکلا نہیں ہے، سارے دروازے ابھی مسدود نہیں ہوئے، ظلمت شب ابھی پوری طرح سایہ فگن نہیں ہوئی ہے۔

لیکن ابھی زخم ہلکا ہے، درد بھی کم ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ زخم ناسور بن جائے اور درد وکراہ سے گزر کر چیخ تک جا پہنچے!!! اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اور سیلاب چھتوں سے گزرنے لگے بند ھ باندھنے کی ضرورت ہے!!! اگر ہم نے متحدہ قیادت کو عملی شکل دے دی تو شاید ذلت سے جھکے ہوئے یہ سر نگاہ اٹھا سکیں، دلوں میں بیٹھ چکا یہ خوف وجبن باہر آسکے!

اگر ایسا ہو جاتا ہے تو مسلم ووٹ بھی متحد ہوسکتا ہے، مسلمانوں کی ایک سیاسی قوت بھی قائم ہوسکتی ہے اور پارلیمنٹ میں ہم اپنی بات پر زور طریقے سے منوا بھی سکتے ہیں، وماذلك على الله بعزيز۔

☆☆☆

راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ (حدیث)

نقطۂ نظر

اسلامک بینکینگ اسلامی سے زیادہ ایک انسانی ضرورت

(اس میدان میں ماہر علماء کی ضرورت کے پس منظر میں)

محمد الیاس ندوی بھٹکلی

مئی ۲۰۰۸ء میں اپنے سفر حجاز کے دوران میں اپنے دوست اور اسلامک ڈیولپمینٹ بنک (I.D.P) کے پروجیکٹ ڈائرکٹر محترم مامون اعظمی صاحب کی دعوت پر جب پہلی دفعہ جدہ میں واقع اس کے صدر دفتر میں حاضر ہوا تو ۱۹۷۵ء میں قائم ہونے والے اس اسلامک بنک کی عالمی سطح پر مثبت اور تیز رفتار کارکردگی کو دیکھ کر اور اس کے متعلق سن کر جہاں مجھے ایک طرف نہایت خوشی ہوئی تو دوسری طرف یہ سن کر نہایت افسوس ہوا کہ جس تیزی سے پوری دنیا میں غیر سودی بنیادوں پر اسلامک بنکوں کا قیام عمل میں آرہا ہے اس تناسب سے ان بنکوں اور شرعی مالیاتی اداروں کو رہنمائی کے لئے شریعت کے ماہرین دستیاب نہیں ہورہے ہیں، مامون صاحب سے یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس میدان میں ماہرین کی قلت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان بنکوں میں موجود اس میدان کے ماہر علماء ہفتہ میں تین دن جدہ کے بنک میں کام کرتے ہیں اور دو دن پڑوس کے خلیجی ممالک میں موجود اسلامک بنکوں میں اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، میرے ساتھ موجود عزیزم حفظ الرحمٰن منیری ندوی بھٹکلی کے متعلق جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد ملیشیا کی اسلامی یونیورسٹی میں شریعہ فائنانس کا اسلامک بینکنگ کورس کررہے ہیں تو ان کی مسرت کی انتہاء نہ رہی، کہنے لگے آپ ہمیں ان جیسے چند علماء دیجئے ہم ان کو منھ مانگی تنخواہ دینے کے لئے تیار ہیں، انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ مدارس کے فارغین کو اس میدان کی طرف متوجہ کروں، ان کے اس فکر انگیز پیغام کو سن کر مجھے اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ اس وقت عالمی سطح پر مختلف یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے اقتصادیات کے ماہر مسلم طلباء سے بھی اسلامی بنکوں کی ضرورت پوری نہیں ہورہی ہے، جو عالمی مالیاتی نظام سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اسلامی مالیاتی نظام کی روح سے ان کو مناسبت نہیں ہوتی، اس کے برخلاف ہمارے علماء بنیادی اسلامی اقتصادی نظام سے دس سال سے زائد فقہ کی کتابوں کو پڑھنے کی وجہ سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ وہ اس کے ماہر بھی ہوتے ہیں لیکن عالمی مالیاتی و بنکنگ نظام سے عدم واقفیت اور اپنی پڑھی ہوئی فقہی بحثوں اور ابواب کو اس سے تطابق نہ دینے کی وجہ سے ان سے اس میدان میں فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے، جبکہ فقہ المعاملات، فقہ المالیات اور الفقہ المقارن کی بحثیں انکی نظر سے گذر چکی ہوتی ہیں، خود ماضی قریب میں بھی جدید اقتصادی نظام سے بھی ہمارے علماء ناواقف نہیں رہے، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ نے اسلام کا اقتصادی نظام کے نام سے جدید اسلامک بنکنگ کے خد وخال پہلے ہی واضح کردیئے تھے، اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ نے اسلامی معاشیات کے جدید اصول وضوابط پر ایک مکمل کتاب تالیف کی تھی، خود مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ

نے بھی آج سے ۵۷ سال قبل جدید سودی نظام کے مضرات وقباحتوں پر قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک معرکۃ الاراء کتاب سود کے نام سے لکھ کر سود سے پاک اسلامک مارکیٹنگ کا تصور سب سے پہلے پیش کیا تھا، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اسلامک بنکنگ میں تخصص کے دوسالہ کورس کے علاوہ ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس یا دوسالہ ڈپلوما کورس شروع کرنے کی طرف فوری توجہ دی جائے تا کہ ملت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوسکے، اس کے علاوہ اس میدان میں کام کرنے والے اسلامک بنکوں ومالیاتی اداروں میں بھی اور ان کے اڈوائزری بورڈ میں بھی شریعت کے ماہرین اور متخصص علماء کی موجودگی ناگزیر ہے ورنہ بہت ساری اسکیموں کا جو عملاً ان اسلامی بنکوں میں رائج ہیں سود کے اشتباہ سے خالی ہونا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے مدارس عربیہ کے طلباء کو جدید عالمی مالیاتی نظام کو سمجھنا اس لئے بھی آسان ہے کہ موجودہ تجارتی اصطلاحات مثلاً ورکنگ پارٹنر شپ، سلینپک پارٹنر شپ ڈپوزٹ، انوسٹمنٹ، گیارنٹی، شیر مارکیٹ وغیرہ اصطلاحات کی تفصیلات شرکت عنان، مضاربت، تکافل، رہن، سلم، مرابحہ وغیرہ کے نام سے وہ پڑھ چکے ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں ابتدائی طور پر علماء کو راغب کرنے کے لئے شروع شروع میں اسلامک بنکنگ کے مختصر تعارفی ورک شاپ سے کام لیا جاسکتا ہے، اس کے بعد ان ہی میں سے کچھ منتخب علماء کو مستقل کورس یا تخصص کیلئے منتخب کیا جاسکتا ہے، عمومی طور پر مدارس دینیہ کے طلباء وفارغین کو اس کام کی طرف آمادہ کرنے کا دوسرا اور سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ کہ جدید مالیاتی نظام اور اسلام کے اقتصادی نظام کے تقابلی مضمون کو ہر مدرسہ کے آخری درجات کیلئے لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لئے کچھ گھنٹے مختص ہوں، اس سلسلہ میں فقہ کے اساتذہ کو ملکی سطح پر ایک تین ماہی تدریسی ورکشاپ قائم کر کے ٹریننگ دی جائے، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اسلامی ماہرین اقتصادیات ہی کا ہمارے مدارس میں مستقل تقرر کیا جائے اور سال بھر ان سے فائدہ اٹھایا جائے، لیکن مدارس اسلامیہ کے موجودہ مالی حالات اور خود ان مدارس میں پہلے سے موجود تفسیر وحدیث کے قدیم سینئر اساتذہ کی موجودگی میں ان ماہرین کیلئے ان کی شایان شان تنخواہوں کا نظم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے، لیکن چوتھا اور سب سے زیادہ آسان وقابل عمل طریقہ یہ ہے کہ ملکی سطح پر کسی بھی بڑے ادارہ کی جانب سے اسلامک بنکنگ کے ایک دوسالہ کورس کا آغاز کیا جائے جس میں ہمارے فارغ علماء میں سے بنیادی طور پر انگریزی سے واقفیت اور دلچسپی رکھنے والوں کو لیا جائے، پہلے سال صرف انگریزی زبان میں مہارت پیدا کرائی جائے اس لئے کہ اس موضوع کا اکثر مواد اس وقت انگریزی ہی میں ہے، دوسرے سال شروع کے چار ماہ میں عالمی مالیاتی نظام سے ان کو واقف کرایا جائے، درمیانی چار ماہ میں اس عالمی مالیاتی نظام کو ان کی فقہی تعلیم وتدریس کی روشنی میں تطبیق دینے کی کوشش کی جائے اور آخر کے چار ماہ ملک یا ملک سے باہر بنکنگ نظام کو براہ راست دیکھنے، سمجھنے اور اس سے واقف ہونے کے لئے خاص کئے جائیں، اس کے لئے ان کی اسلامک بنکوں میں اعزازی طور پر چار ماہ کی ٹریننگ کو لازمی قرار دیا جائے، اس طرح کرنے سے دو فائدے حاصل ہونگے، اول یہ کہ عالمی سطح پر اس میدان میں ماہرین شریعت کی قلت دور کی جاسکے گی دوسرے یہ کہ یہ علماء خود برصغیر کے مدارس میں اور بہتر طریقہ سے ہمارے طلباء کی رہنمائی کرسکیں گے، اس کے لئے بڑے بجٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے، ابتداء میں بیس طلباء کا انٹرویو کے بعد انتخاب کیا جائے، ان میں سے ہر طالب علم سے ماہانہ فیس دو ہزار روپئے لئے جائیں اور ان کی تربیت اور رہنمائی کرنے والوں کو اس میں سے پرکشش تنخواہ دی جائے، جو طلباء صلاحیت کے باوجود مالی استطاعت نہ رکھتے ہوں ملت کے صاحب خیر ان کے لئے کفالت

اوراسکالرشپ کانظم کریں۔

مذکورہ بالا پوری بحث اسلامک بنکنگ نظام میں ماہر علماء کی ضرورت کے پس منظر میں تھی، اب اس مرکزی موضوع کے دوسرے حصہ کی طرف چلیں جس میں اسلامک بینکنگ کو اسلامی سے زیادہ انسانی ضرورت کے تحت عالم انسانیت کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے، بالخصوص عالمی سطح پر اسلام کو درپیش حالات کے پس منظر میں دعوتی حکمت عملی کے تحت اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، گذشتہ دو سالوں سے شروع ہونے والی کساد بازاری، سودی نظام کی ناکامی اور یوروپی وامریکی بنکوں کے یک لخت دیوالیہ ہونے کے تناظر میں ادھر گذشتہ چند سالوں میں اسلام کے مبنی بر عدل غیر سودی نظام کو ثابت کرنا اس وقت جتنا آسان ہے اس سے پہلے تاریخ میں ہمیں کبھی اس طرح کا سنہرا موقع نہیں ملا ہے، اس لئے کہ انسانیت سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی اور سوشلزم کے زوال کے بعد ایک عادلانہ اور منصفانہ متبادل عالمی مالی نظام کی شدت سے منتظر ہے جو اس کو اسلام کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا، اسلامی بنکنگ کی انسانی ضرورت کو ثابت کرنے کی ہماری حکمت عملی سے اسلام سے نفرت اور الرجک رکھنے والوں اور متعصّبانہ ذہنیت کے مالک افراد کے لئے بھی احکام خداوندی کی غیر معمولی حکمت ومصلحت سے واقف کرا کر اسلام کے قریب کرنا ہمارے لئے پہلے سے زیادہ آسان ہو جاتا ہے، مثلاً پہلی دفعہ جب برطانیہ میں وہاں کے میڈیا نے غیر جانب دار ہو کر اعداد وشمار کی روشنی میں برطانیہ میں قائم دارالقضاء اور شریعت کورٹ کی کارکردگی کے مسلم معاشرہ پر مرتب ہونے والے مثبت نتائج کو ظاہر کیا تو دو سال میں خود غیر مسلموں بالخصوص تعلیم یافتہ عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے نکاح وخلع، طلاق وفسخ وغیرہ کے معاملہ میں ان اسلامی عدالتوں سے رجوع کرنا شروع کیا اور ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان کو صحیح انصاف سرکاری عدالتوں کے بجائے مسلم دارالقضاء ہی میں مل سکتا ہے، اسی طرح امریکہ اور فرانس میں جب غیر اسلامی ذبیحہ کے طریقوں پر انسانی وطبی نقطہ نظر سے بحث کی گئی اور اس کے مقابلہ میں اسلامی ذبیحہ کے انسانی صحت پر پڑنے والے مثبت اثرات کا تفصیلی تجزیہ مسلسل الیکٹرونک میڈیا میں نشر ہوتا رہا تو گذشتہ کئی سالوں سے حلال ذبیحہ کے خریداروں میں خود امریکیوں اور فرانسیسیوں کا اوسط تیزی سے بڑھنے لگا، ٹائمس میگزن امریکہ کی تازہ رپورٹ کے مطابق سال ۲۰۰۸ تا ۲۰۰۹ کے دوران حلال غذا کی مالیت ڈیڑھ سو ارب ڈالر سے ۶۳۲ امریکی ڈالر ہو گئی تھی، یہ ویسے ہی تھا جیسا کہ عالم اسلام میں پہلی دفعہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مسلمانوں کے سیاسی زوال وتنزل کو مسلمانوں کے حق میں نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے حق میں ایک ناقابل تلافی خسارہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی اور اس سلسلہ میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کے ذریعے پوری انسانیت کی جانب سے داد تحسین حاصل کی تھی۔

ان ہی تجربات کی روشنی میں ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر سودی نظام کو غیر اسلامی نظام ثابت کرنے سے زیادہ غیر انسانی، غیر طبعی اور غیر اخلاقی ثابت کرنے پر پورا زور صرف کر دیا جائے اور اعداد وشمار اور حقائق وواقعات کی روشنی میں اس بات کو ثابت کیا جائے کہ اس غیر انسانی سودی نظام نے صرف گذشتہ سو سال میں انسانیت کو معاشی واقتصادی اعتبار سے بھی ہلاکت کے کس غار تک پہونچا دیا ہے، اس کے لئے صرف امریکی ویوروپی بنکوں کی مثالیں کافی ہیں، ہمیں دنیا کو یہ بتانا ہے کہ عالمی سطح کی موجودہ کساد بازاری اور کروڑوں انسانوں کی یک لخت بے روزگاری کے پس پردہ اسی سودی نظام کی خباثتیں ہیں جس نے قرضوں تلے

دے ہزاروں انسانوں کو خودکشی پر مجبور کیا، پلک جھپکنے میں کروڑ پتی سے بھک پتی کر دیا، سودی قرض لینے والوں کو اسراف وعیش پسندی کا خوگر بنادیا، اخلاقی حدود وقیود کو پامال کر دیا، کریڈٹ کارڈ کی شکل میں انسانوں کو راتوں رات دیوالیہ کر دیا، اسی مالی نظام نے انسانوں کو اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنے کا عادی بنادیا، غریب کو غریب تر کر دیا اور عالمی سطح پر غربت کے گراف میں ناقابل یقین اضافہ کیا، اسی غیر سودی نظام نے پہلے خود سود لینے والوں کو ڈبو دیا اور کنگال کیا، بالآخر گذشتہ دو سال کے اندر وہ مناظر بھی چشم فلک نے دیکھے کہ جس نے دوسروں کو کنگال کیا ایک دن وہ خود بھی کنگال ہو گیا، یورپ کے اسٹاکس ایکسینج اچانک بیٹھ گئے امریکی انشورنس کمپنیاں دیکھتے دیکھتے بیٹھ گئیں، برطانیہ اور فرانس کے شیر بازار خود اپنے اصل سرمایہ اور Assets سے بھی محروم ہو گئے یہ تو دیر سویر ہونا ہی تھا اس لئے وعدہ خداوندی ہے کہ " یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات "(اللہ تعالی سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔

دوسری طرف ہمیں عالم اسلام کو یہ دکھانے کی بھی ضرورت ہے کہ مغرب کے اسی خود ساختہ سودی نظام کے مقابلہ میں جب اسلام کے غیر سودی عادلانہ اور منصفانہ مالیاتی تجربات کو روبہ عمل لایا گیا تو انسانی طبقات پر اس کے غیر معمولی اثرات کیسے مرتب ہوئے، پہلی دفعہ باقاعدہ ۱۹۶۳ء میں مصر کے ایک گاؤں میں اسلامک بنکنگ کا چھوٹا سا تجربہ کیا گیا اور اب تک الحمد للہ ۵۷ سے زائد مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں تین سو سے زائد اسلامک بنک اور شریعت کی بنیادوں پر قائم مالیاتی ادارے وجود میں آئے جو اس وقت انڈونیشیا، ملیشیا، ایران، سوڈان، اردن، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور کویت وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور الحمد للہ ہر سال اس میں دس فیصد کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے اور ان اسلامی بنکوں میں آج بھی تقریباً پانچ کھرب ڈالر کا محفوظ سرمایہ موجود ہے جو عالمی بنکوں میں موجود امریکہ کے ۱۲ء۷ ٹریلین ڈالر کے مقابلہ میں ۴٪ کے قریب ہے، ہمیں برادران انسانیت کو یہ بتانا ہے کہ اسلامی بنکنگ کی عالمی سطح پر مقبولیت کا اندازہ وہ صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ برطانیہ کی یونیورسٹی آف ریڈنگ نے اسلامک فائنانس کورس کے لئے ایک مستقل شعبہ شروع کیا ہے، فرانس کی یونیورسٹی کی طرف سے بھی اس طرح کی خوش کن اطلاعات آرہی ہیں، ملیشیا میں اسلامک بنکنگ سے استفادہ کرنے والوں میں پہلے سال ہی ۵۰٪ سے زائد غیر مسلم تھے، سنگاپور نے جب اسلامک بانڈ جاری کئے تو اس سلسلہ میں سرمایہ کاری کرنے والوں کا اندازہ تھا کہ اسلامک بانڈ کی مقبولیت کا یہی حال رہا تو صرف اگلے دو تین سالوں میں اس کی مالیت ایک کھرب ڈالر تک بآسانی پہونچ جائیگی، امریکہ میں اسلامک بنک کا آغاز ہو چکا ہے، خود فرانس کی حکومت بھی اپنے یہاں اس غیر سودی اسلامی بنکنگ نظام کو جاری کرنے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں جب بنی نوع انسانی کے سامنے اللہ تعالی کے حرام کردہ سودی نظام کے مضرات ونقصانات کی تفصیلات پیش کی جائیں گی تو ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس سودی نظام کے خلاف بغاوت کرنے والوں اور اس کے مقابل میں اسلامی مالی نظام کو جاری کرنے کا مطالبہ کرنے والوں میں خود غیر مسلم مسلمانوں سے زیادہ پیش پیش ہونگے، اس طرح امید ہے کہ انسانیت کو اللہ رب العزت کے غیر معمولی غیظ وغضب سے بچانے میں ہمارا یہ اسلامی مالیاتی نظام سب سے اہم رول ادا کریگا۔"وماذلک علی اللہ بعزیز"

☆☆☆

اصلاح معاشرہ

دینی واصلاحی جلسے: چند قابلِ توجہ پہلو

نایاب حسن

علمائے کرام انبیا کے وارث ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے اقوال کی روشنی میں انھیں پوری امت پر وہ فضیلت و برتری حاصل ہے، جو امت کے دوسرے افراد وطبقات کو حاصل نہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی امت کے عابدوں پر عالموں کو فضیلت دی ہے (سنن ترمذی، ح:۲۶۸۷) آپؐ نے ایک حدیث میں تو یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں (المقاصد الحسنہ، ح:۶۷۰) قرآن کریم میں بھی جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ''علم والے اور بے علم لوگ برابر نہیں ہوسکتے'' (الزمر:۹) اس سے بھی مراد وہی اہلِ علم ہیں، جو دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے، خدائے تعالیٰ کی تخلیقات میں غور وتدبر کرنے والے اور کائنات کے ذرات میں مخفی فطرت کے اشاروں کو سمجھنے والے ہیں۔ پھر علماء کو یہ مقام ومرتبہ یوں ہی نہیں مل گیا ہے؛ بلکہ اس کے بے شمار تقاضے بھی ہیں اور اَنیک ذمے داریاں بھی، کہ:

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کو سوا مشکل ہے

نبی اکرم ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد اس دینِ متین کے تحفظ وبقا اور اس کی ترویج واشاعت کی ساری ذمے داری علمائے امت کے کندھوں پر ہے، یہ ان کا دینی فریضہ ہے کہ وہ دین کے علوم کو حاصل کرکے اگلی نسل تک پہنچائیں اور امت کی عملی، فکری وعقائدی خامیوں کو دور کرنے کے جتن کریں، ان کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو نبوی صفات وخصوصیات سے آراستہ کریں اور امت کے سامنے ایک بہترین عملی نمونہ پیش کریں، ان کی ذمے داری یہ بھی ہے کہ وہ موجودہ ناگفتہ بہ دور میں دینِ اسلام کی عصری معنویت اور اس کی دائمی آفاقیت وعالمگیریت سے لوگوں کو آشنا کروائیں اور جو لوگ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرنے سے اِنکاری ہیں یا جو مانتے ہیں، مگر ان کی عملی دنیا گمرہی وکج روی کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، اُنھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ بحمداللہ ایسے علما ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں اور آج کے تشویش ناک ماحول میں بھی ایسے خدامستوں کی مسعود ہستیاں روئے زمین کے ہر خطے میں پائی جاتی ہیں، جن کی نظروں سے دلوں کی دنیا بدلتی، جن کی باتوں سے پژمردگیِ قلب وروح ختم ہوتی اور جنھیں دیکھنے سے خدا یاد آجاتا ہے، ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں، جو اپنی مسحور کن اور اثر وتاثیر میں ڈوبی ہوئی باتوں کے ذریعے حق کے کٹر سے کٹر دشمن کو اسلام کا ہمنوا بنا لینے کی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں اور ان ہی لوگوں کی بدولت آج اسلام دنیا میں سب سے زیادہ قبول کیے جانے والے مذاہب میں اول نمبر پر ہے، گرچہ ایسے افراد کی بھی کمی نہیں، جو اپنے دل، قلب اور روح میں برپا ہونے والی ہلچل سے عاجز آکر سکون کی تلاش میں اسلام کی بنیادی تعلیمات، قرآنِ مقدس اور احادیثِ مبارکہ کو پڑھتے اور ان کی غیر معمولی جاذبیت انھیں

دامنِ اسلام کی جانب کھینچ لے آتی ہے۔مگراس کے باوجود شخصیتوں کی تاثیر سے انکارنہیں کیا جاسکتااوراسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ماضی میں کتابوں کے ساتھ نبیوں اوررسولوں کوبھی مبعوث فرمایاتھا۔

یہ علماءِ تبلیغِ اسلام اور معاشرے کی اصلاح کے لیے ہر دور میں الگ الگ طریقے اختیار کرتے رہے ہیں،ان ہی میں سے کچھ طریقے وہ ہیں،جوآج کل بہت رائج ہیں،مثلاً:تبلیغی تحریک کی شکل میں ،اس طرح کہ کچھ لوگوں کی ایک جماعت دنیا بھر کے مختلف ملکوں،شہروں،دیہاتوں کی مسجدوں میں جاکر قیام کرتی اور وہاں گردوپیش میں رہنے والے اُن مسلمانوں کودین کے مبادیات سے واقف کراتی اور انھیں مسجد کی طرف لاتی ہے،جوباوجودمدعیِ اسلام ہونے کے دین کے بنیادی ارکان کی ادائیگی سے غافل ہوتے اورانھیں بنیادی تعلیمات کی بھی خبرنہیں ہوتی،کچھ ایسے لوگ بھی ہیں،جواپنے علم و مطالعہ اورحیثیت و طاقت کے مطابق غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہیں اوران کی کوششیں بھی بارآور ہوتی ہیں اورایک طریقہ ہے جلسوں کا کہ کسی متعین شہر یا گاؤں میں،کسی متعین تاریخ میں ''اصلاحِ معاشرہ''یا''سیرتِ نبوی ﷺ''یااسی قسم کے کسی عنوان کے تحت کسی دینی ادارے میں یا گاؤں کی کسی کھلی جگہ میں ایک پروگرام منعقد کیا جائے اوراس میں عام لوگوں کودین کی باتیں بتلائی جائیں اور انھیں اسلام کی موٹی موٹی اور بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے،بلاشبہ یہ طریقہ بھی اسلام کے تعارف کی توسیع اور اس کی اشاعت اور ناخواندہ و عام مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے حوالے سے اہم ہےاوراس کے فوائد بھی حاصل ہوتے رہے ہیں،کم ازکم ہندوستان میں تواس قسم کے اجتماعی پروگرام یا جلسوں کی روایت صدیوں پرانی ہے،خودہمارے نبی ﷺ بھی صحابۂ کرام کواکٹھا کرکے انھیں دین کے مسائل اوراخلاق کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

مگر یہ جو جلسے والی روایت ہے،اس میں فی زمانہ متعددخرابیاں درآئی ہیں۔جوسنجیدہ قسم کے لوگ ایسے جلسوں میں بحیثیت سامع شریک ہوتے ہیں یا اُنھیں بطورمہمان مدعوکیا جاتا ہے،اُنھیں اندازہ ہوگا کہ فی الوقت ایسے جلسوں سے اصلاح کا مقصدتوکم حاصل ہورہاہے،البتہ اس کے مقابلے میں فساد و بگاڑ کے نت نئے دروازے کھلتے جارہے ہیں،آپ تحقیق کریں،توبہت سے ایسے''مولوی نما'' جاہل ملیں گے،جوان جلسوں میں ایک خاص فنکارانہ رنگ وآہنگ میں بےسرپیر کی باتیں کرکے،من گھڑت لطائف وظرائف سنا کرعوام کوذہنی تفریح مہیا کراتے اوراپنی جیبیں بھرتے ہیں،رات میں دودو،تین تین،چارچار گھنٹے ان کی لچھے دارتقریرہوگی اورصبح پو پھٹنے سے پہلے ہی یہ لوگ اپنا''نذرانہ''ہتھیا کر چلتے بنتے ہیں،بہت سے لوگ ان کی حقیقت سے واقف بھی ہوتے ہیں،مگرچوں کہ اب دین کے نام پر تفریح بھی لوگوں کا مزاج بنتا جارہاہے،سووہ بھیڑجمع کرنے کے لیے ایسے ہی لوگوں کو بلاتے ہیں؛حالاں کہ ہندوستان بھرمیں قابل،ذی علم و ذی ہوش علماے کرام کی کوئی کمی نہیں،جوصحیح معنوں میں ملت کا دردرکھتے ہیں اوروہ اس کی صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں اور کرنا بھی چاہتے ہیں،مگرچوں کہ عام طورپروہ چرب زبان نہیں ہوتے؛اس لیے:

پھرتے ہیں میرخوارکوئی پوچھتانہیں!

ایک اور بہت بُری لت، جوبطورِخاص بہار کے مسلمانوں کولگتی جارہی ہے،وہ یہ ہے کہ دینی واصلاحی جلسوں میں ایسےادنیٰ درجے کے شاعروں کوبھی دھڑلّے سے بلایاجاتا ہے،جوفی الحقیقت گویّے ہوتے ہیں اورجن کی شاعری توعام طور پر دینِ اسلام اوراس کی تعلیمات کی فضیلتوں پرمشتمل ہوتی ہے،مگران کا سراپااورطرزِعمل خوداُن کی چغلی کھارہاہوتاہے،نتیجتاًان کے اشعار سامعین کے کانوں کوعیاشی فراہم کرنے کے علاوہ کسی اورفائدے کا سبب نہیں بنتے،مزید یہ کہ ایک اصلاحی جلسہ اچھے خاصے مشاعرے میں بدل کررہ جاتا ہے،آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب جلسہ ایک رات کا ہے،کل وقت زیادہ سے چھ گھنٹے

کا ہے،مقرروں کی تعداد کم از کم چار پانچ تو ہوتی ہی ہے،اوپر سے شعرا بھی تین چار سے کم نہیں ہوتے،تو اس جلسے میں کیا ہوگا،یہی وجہ ہے کہ عموماً یہ جلسے ،جلسے تو کم مگر مشاعرے زیادہ ہوتے ہیں اوران کا نتیجہ سوائے ''آمدند،نشستند،خوردند ورفتند'' کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا؛ بلکہ بسا اوقات توان اجتماعی موقعوں پر ایسے ایسے حادثات بھی رونما ہوجاتے ہیں،جنھیں قلم وزبان پر لایا بھی نہیں جاسکتا۔ان جلسوں کی ایک بڑی خامی، جو حالیہ چار پانچ سالوں میں متعارف ہوکر سامنے آئی ہے،وہ یہ ہے کہ مشاعروں کے طرز پران میں باقاعدہ ''اناؤنسر'' بھی بلائے جاتے ہیں،جن کی طولانی تمہیدات میں ہی پورے پروگرام کا کم وبیش ایک تہائی حصہ تو ضائع ہوہی جاتا ہے،عام طور سے یہ اناؤنسر حضرات زبان و بیان کے پیچ وخم سے نابلد ہونے کے ساتھ الفاظ والقاب کی لطافت و نازکی اوران کے محلِ استعمال سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، بہت سے جلسوں میں یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک واقعی قابل،عالم،فاضل اور باکمال مقرر کوسیدھے سادے الفاظ میں دعوت دے دی گئی،جبکہ ایک ''پینترے باز'' مقرر کے لیے زمین وآسمان کے قلابے ملادیے گئے۔بے جاالقاب کا استعمال تو ہمارے مذہب میں یوں بھی ممنوع ہے،ہمارے نبی ﷺ نے جتنے بڑے بڑے شاہانِ عصر کواپنے مکتوبات روانہ فرمائے تھے،ان کے ناموں میں صرف ''محمد بن عبداللہ'' لکھوایا اور اندر صرف ''رسول اللہ'' ،آپؐ نے ایک بار صحابۂ کرام کونصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''تم لوگ میری تعریف میں اس طرح مبالغہ آرائیاں مت کیا کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے عیسی بن مریمؑ کے ساتھ کیا،میں تومحض اللہ کا بندہ اوراس کا رسول ہوں؛لہذا تم مجھے عبداللہ اوراللہ کا رسول ہی کہا کرو''۔(صحیح بخاری،ح:۳۲۱۳) تو کیا ضرورت ہے کہ ہم کسی کی وقتی خوش نودی حاصل کرنے اورواہ واہی بٹورنے کے لیے خواہ مخواہ لفظوں کا پُرشور دریا بہادیں۔

یہ ایک بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے،وقت رہتے علماے کرام کواس طرف توجہ دینی چاہیے،یہ بہت اچھی اور قابلِ قدر بات ہے کہ ہم معاشرے کی اصلاح کی مہم چلارہے ہیں،مگر ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اس کے پردے میں نادانستہ طور پر ایسے اقدامات تو نہیں کررہے،جو معاشرے کے مزید بگاڑ اور فساد کا سبب بن رہے ہیں؟ایسے پیشہ ور خطبا،واعظین اور شعرا کی ایک پوری کھیپ میدان میں اُتری ہوئی ہے،جو قول وعمل کے تضاد،فکری سطحیت،علمی اِفلاس،ذہنی پسماندگی وپس گردی، اخلاقی زوال،نظراورنظریے کی بے سمتی کی شکار ہے اورنتیجتاً ان اصلاحی جلسوں سے ملت کوفائدے کی بجائے نقصان ہی اٹھانا پڑ رہا ہے۔اگر عام مسلمان اپنی محنت اورخون پسینے سے کمائے ہوئے روپے پیسے دین اوراصلاح کے نام پر اکٹھا کرکے کوئی جلسہ منعقد کرتے اوراس میں شریک ہونے والے علاومقررین اورمہمانوں کومنہ مانگی رقمیں دیتے ہیں،تو یہ اُن کا حق ہے کہ ان کی صحیح رہنمائی کی جائے،انھیں دین کی صحیح باتیں بتائی جائیں،انھیں ملک کے موجودہ تشویش ناک حالات سے باخبر کرکے انھیں اسلام کی صحیح نمایندگی کی تلقین کی جائے،نہ یہ کہ اُنھیں محض چند تفریحی باتیں سنا کر ٹرخادیا جائے اور مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ دین اور اصلاح کے نام پر کیے جانے والے پروگرام کوتفریحِ طبع کا رنگ نہ دیں،پہلے اپنے علاقے کے کسی قابل ومخلص عالمِ دین یا خطیب سے مشورہ کریں اوران کے مشورے کی روشنی میں ہی پروگرام کا خاکہ بنائیں؛تاکہ ان کی مادی ومعنوی کوششیں بارآور ہوں اورانھیں دین و دنیا کے تعلق سے مفید معلومات حاصل ہوسکیں۔ابھی چوں کہ جلسوں کا موسم ہے اورمارچ سے لے کر جون تک یوپی اور بہار کے گاؤں دیہاتوں میں دینی جلسے تواتر کے ساتھ کیے جاتے ہیں؛اس لیے یہ زمینی حقائق سپردِ قلم کردیے گئے ہیں،سوان کوکسی منفی نظریہ یا نکتۂ خیال کا مظہر گردانے کی بجائے حالات کا سنجیدگی ودیانت داری کے ساتھ جائزہ لینے اورمعاملے کی سنگینی کوسمجھنے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆

رمضان کا پیغام

ماہِ رمضان المبارک: نفس وروح کی تطہیر کا موسم

مولانا اسرارالحق قاسمی

رمضان المبارک کے روزے امت مسلمہ پر فرض کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالی نے فرمایا ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے جو تم سے پہلے ہو گذرے ''(بقرہ ۱۸۳) اگلی آیت میں ان فرض روزوں کی تعیین کر دی گئی ہے ، پس جو شخص بھی تم میں سے اس مہینہ کو پائے اس پر لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے'' (بقرہ ۱۸۵) ''روزہ'' بنیادی طور پر تین چیزوں سے رکنے کا نام ہے۔ اول کھانے سے، دوسرے پینے سے، تیسرے مجامعت کرنے سے۔ روزہ کا وقت صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے۔ روزہ رکھنے سے پہلے سحری کھانا اور روزہ کی تکمیل پر افطار کرنا مسنون ہے۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق سحری کھانے اور افطار کرنے میں بڑا ثواب ہے۔

عاقل، بالغ مسلمانوں کے لیے اس وجہ سے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ یہ دوزخ سے خلاصی اور جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے، اس کے واسطے سے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا آسان ہے اور خود کی روحانی، اخلاقی اور جسمانی اصلاح کے لیے بھی روزہ ایک مؤثر ترین ذلیعہ ہے۔ روزے رکھ کر ایک گناہ گار شخص گناہوں سے تائب ہوسکتا ہے، نفس کی پیروی کو چھوڑ سکتا ہے، باطن کی صفائی کر سکتا ہے، اپنے آپ کو باضمیر اور صاحب کردار شخص بنا سکتا ہے، تقوی کی راہ اختیار کر سکتا ہے اور عبادت خداوندی ہی کو اپنا مطمح نظر بنا سکتا ہے۔

روزے رکھنے کی اس لیے بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس کے بہت سے چھپے اور کھلے مقاصد وفوائد ہیں۔ روزہ کے اہم ترین مقاصد میں ''تقوی'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ تقوی اللہ کو بے حد پسند ہے، تقوی سے مراد یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اللہ سے ڈرے، ہر غلط کام سے بچے، اپنی نفسانی و ہیجانی خواہشات کو قابو میں رکھے، ہر حالت میں صابر وشاکر رہے، رضائے الہی کی جستجو میں لگا رہے اور خشوع و خضوع کے ساتھ ہمہ وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ روزہ کیونکہ ان تمام چیزوں کو جامع ہے، اس لیے اس سے بآسانی یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

روزہ رکھنے کے بعد انسان میں کئی طرح کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں ۔ایک یہ کہ روزہ دار اپنے آپ کو اس بات کا اہل بنالیتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر خواہشات پر کنٹرول کر سکے۔ اگر اس کا جی کھانے کو چاہے، تو نہ کھائے، اگر پینے کو چاہے تو نہ پیے، اگر مجامعت کو چاہے تو وہ بھی نہ کرے۔ یہ تینوں چیزیں انسان کی بنیادی ونفسانی خواہشات کی مرکز ہیں۔ ان پر کنٹرول کر لینا ہر چیز پر کنٹرول کرنے کے برابر ہے۔ روزہ کے علاوہ ان اشیاء پر قابو کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ جب لوگوں کو بھوک لگتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح کھانے کا انتظام کر لیتے ہیں ، پیاس لگتی ہے تو وہ تڑپ جاتے ہیں اور کسی بھی طرح اس کا بندوبست کر کے سیرابی حاصل کر لیتے ہیں۔ بیوی سے مجامعت کو جی

چاہتا ہے تو اس پر قابو بھی دشوار ہو جاتا ہے لیکن روزہ رکھ کر خوف خدا کی وجہ سے کوئی شخص ان تینوں چیزوں کے قریب نہیں جاتا یعنی روزے کے ذریعہ ہی ان پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

ان بنیادی چیزوں وصورتوں پر قابو پانے کے بعد تقوی کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ کے لیے اہم چیزوں کی قربانی کے ان تقاضوں کو آسانی سے پورا کیا جا سکتا ہے کہ روزہ دار فحش باتوں سے پرہیز کرے، کسی کو گالی نہ دے، کسی کے مال کی طرف ناجائز طور سے نہ دیکھے، رزق کے حصول میں حلال طریقوں ہی کا سہارا لے، کسی کو بے جا نہ ستائے، کسی پر ظلم وتشدد نہ کرے، سخت و ترش لہجے میں بات نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، وعدہ خلافی نہ کرے ،لہو ولعب سے دور رہے، رشوت خوری سے پرہیز کر، بدعنوانی کے قریب نہ جائے، فحاشی، بے حیائی اور عیاشی کو الوداع کہے، اپنے آپ کو عبادت اور خدمت خلق میں مشغول رکھے، حمد وشکر کے ساتھ ہر نیک عمل کی طرف بڑھے اور ہر برے کام سے اجتناب کرے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایسے بہت سے روزے دار ہر جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں، جو روزے کی حالت میں سوائے کھانے، پینے اور مجامعت سے رکنے کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں رکتے۔ جھوٹ بھی بولتے ہیں، وعدہ خلافی بھی کرتے ہیں، لہو ولعب میں بھی مشغول رہتے ہیں، بے حیائی وفحاشی سے بھی دامن نہیں بچاتے، بدکلامی اور گالی گلوچ تک پر اتر آتے ہیں، ذکر واذکار میں بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ دراصل ایسے روزے دار روزہ تو رکھتے ہیں، مگر اس کے مقصد کو نہیں سمجھتے۔ شاید انہیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ اس طرح اجر عظیم سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یاد رہنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص روزہ دار ہو کر بھی تقوی کی طرف نہ آیا، فحش گوئی کرتا رہا، جھوٹ بولتا رہا اور برے کاموں میں مشغول رہا تو پھر روزہ کا مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے کہ ایسے روزہ سے وہ سب کچھ نہیں حاصل ہونے والا، جو اسے حاصل ہونا چاہئے۔ ایسے روزے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جس شخص نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس سے کیا سروکار کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہا'' (بخاری شریف) رسول اللہ ﷺ نے روزے دار کو تقوی اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''روزہ ڈھال ہے اور تم میں سے جب کوئی کسی دن روزے سے ہو تو اسے چاہئے کہ زبان فحش اور گندی باتوں سے آلودہ نہ کرے، شور برپا نہ کرے، اگر کوئی اس سے گالی گلوچ پر اتر آئے یا لڑائی کے لیے آمادہ ہو جائے تو اسے دل میں سوچنا چاہئے کہ میں تو روزے سے ہوں''۔ (بخاری ومسلم)

روزہ کے دوران روزہ دار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائش وزیبائش سے کنارہ کش ہو کر معبود حقیقی کی طرف راغب ہو جائے اور عمل سے یہ ثبوت دے کہ وہ اپنے مالک حقیقی کے لیے اپنی تمام تر ضرورتوں، چیزوں کو قربان کر چکا ہے۔ وہ اللہ کے راستے میں ہے، اس کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ دنیا ومافیہا سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ نہ اسے کھانے سے مطلب ہے نہ پینے سے مطلب ہے نہ اسے بیوی کے ساتھ میل ملاپ سے مطلب، نہ اسے دنیاداری سے مطلب، مطلب ہے تو صرف اپنے پروردگار سے۔

روزہ دار کو روزہ رکھتے ہوئے یہ بھی طے کر لینا چاہئے کہ اس کا مقصد جہاں عبادت میں مشغول رہنا ہے، وہیں اسے اس اثنا میں ایک صاحب کردار اور نیک وصالح انسان بننا بھی ہے۔ کیونکہ روزہ رکھ کر اور اس کے تقاضوں کو پورا کر کے صاحب کردار اور باضمیر انسان بننا آسان ہے۔ مگر آج کل زیادہ تر روزے دار اپنے سامنے اس مقصد کو نہیں رکھ رہے ہیں۔ جس کے سبب وہ رمضان المبارک کے پورے مہینہ کے روزے رکھنے کے باوجود نہ متقی بن پاتے ہیں، نہ نیک وصالح اور صاحب کردار انسان۔ جو عیوب اور غلط عادتیں رمضان سے پہلے ان میں ہوتی ہیں وہ مسلسل انتیس یا تیس روزے رکھنے کے بعد بھی رہتی ہیں۔ اس بات کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ روزے دار کے پیش نظر یہ بات رہنی چاہئے کہ روزوں کی فرضیت منعم حقیقی کی جانب

سے ان پر ایک بڑا احسان ہے، جس میں انہیں دینی، اخلاقی اور انسانی تربیت کا بھرپور موقع ملتا ہے۔ اگر وہ اس اثنا میں پورے طریقہ سے اسلام پر عمل پیرا ہوں، تو ان کی بہترین تربیت ہوسکتی ہے اور پھر اس تربیت کو رمضان کے بعد بھی باقی رکھا جائے تو پورے معاشرے میں تقوی و پرہیزگاری کا ماحول قائم ہوسکتا ہے اور معاشرہ آنا فانا برائیوں سے پاک ہوسکتا ہے۔

روزوں کو ایک وقت متعینہ میں فرض کر کے امت مسلمہ کے لیے ایک ایسا ماحول فراہم کیا گیا ہے کہ تمام مسلمان یہ محسوس کرسکیں کہ وہ سب برابر ہیں، نہ ان میں کوئی بڑا ہے، نہ کوئی چھوٹا، نہ کوئی امیر اور نہ کوئی غریب، نہ بادشاہ اور نہ فقیر۔ جب سب لوگ انسانی زندگی کے مقصد کے حصول میں برابر ہیں تو پھر خاندانی، نسلی، مسلکی اختلافات کے کیا معنی؟ اللہ کے نزدیک ہر اس شخص کا اہم مقام ہے جو روزہ دار ہے، خلوص نیت کے ساتھ اس کے لیے روزہ رکھتا ہے، اور اس کے تقرب کے لیے بھوکا، پیاسا رہتا ہے اور ہر طرح کی نفسانی خواہش سے اجتناب کرتا ہے۔ یہ کام چاہے امیر کرے، فقیر کرے، خان کرے، سید کرے یا وہ شخص کرے جس کو چھوٹی ذات کا یا حقیر برادری کا تصور کیا جاتا ہے۔ اللہ کے نزدیک اہمیت کا حامل ہے۔ غور کیجئے کہ روزہ کی فرضیت سب کے لیے یکساں ہے، ایسا نہیں ہے کہ امیروں کے لیے کچھ زیادہ ہو اور غریبوں کے لیے کچھ کم ہو۔ یا کسی بڑی برادری و ذات کے لیے مخصوص روزہ ہو اور جس برادری کو کمتر سمجھا جاتا ہے اس کے لیے دوسرا روزہ ہو۔

روزہ ماہ رمضان میں فرض کیا گیا، تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس ماہ میں پورے مسلم معاشرے میں ایک خاص فضا بن جاتی ہے۔ رمضان کا ماحول ہمیں شہروں میں بھی دکھائی دیتا ہے، دیہاتوں میں بھی نظر آتا ہے، ملک اور ملک کے باہر بھی یہی ماحول نظر آتا ہے کہ سب لوگ روزے رکھنے کی وجہ سے پورے دن بھوکے پیاسے رہتے ہیں، صبح کو سحری میں لوگ اٹھتے ہیں، سورج غروب ہونے کے بعد سب لوگ افطار کرتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض لوگ مسجد میں روزہ افطار تے ہیں، بعض لوگ گھروں میں، لیکن سب ایک ہی وقت میں روزہ افطار کرتے ہیں۔

روزہ جیسی اہم عبادت کے اس پیغام کے باوجود عام طور سے دیکھا جاتا ہے، کہ ماہ رمضان گزرتے ہی لوگ ایک بار پھر اپنی پرانی روش پر آجاتے ہیں، گناہوں کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں، خاندانی، مسلکی اختلافات کو ہوا دینے لگتے ہیں۔ اور ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں'' کے مصداق نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ماہ رمضان میں ایک ساتھ روزہ رکھ کر ان کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے بھائی چارے کا ماحول آگے بھی برقرار رکھتے، گناہوں سے اجتناب کرتے، غرباء، فقراء اور مساکین کی مدد کرتے، تقوی اختیار کرتے، نیکیوں کو حاصل کرنے کی طرف لپکتے اور اللہ کی خوشنودی کو اپنا مطمح نظر سمجھتے۔

روزہ اور نماز کی طرح اللہ تعالی نے ''حج'' جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے بھی اجتماعیت رکھی ہے، تاکہ تمام مسلمان مشرق ومغرب سے اکٹھے ہوکر بیت اللہ میں جمع ہوں۔ سب ایک ساتھ مل کر لبیک کی صدائیں بلند کریں۔ حج کے موق پر یہ عظیم اجتماع عالمی سطح پر مسلمانوں کو جمع ہونے کا شاندار موقع اسی لیے فراہم کرتا ہے کہ مسلمان عالمی سطح پر اپنے درمیان اتحاد کو باقی رکھیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر اسلام نے اہم عبادتوں میں اجتماعیت کو کیوں قائم کیا ہے جو لوگ اس واضح پیغام کو سمجھنے کے بعد بھی غفلت کا ثبوت دیتے ہیں، وہ امت مسلمہ کو منتشر کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور جو لوگ اجتماعیت قائم کرتے ہیں وہ جہاں ایک طرف اہم عبادات کی ادائیگی پر کھرے اترتے ہیں، وہیں وہ امت مسلمہ کے اتحاد کو قائم کرنے والے ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ بڑے اجر کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

ذکر رفتگاں

مثالی انسان-رفیع احمد علوی

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نوٹ: ۲۲/اپریل کو جب مجھے قبل مغرب پروفیسر رفیع احمد علوی مرحوم کے انتقال کی خبر ملی تو فوراً ہی چند سطریں میں نے رابطہ عامہ کی سائٹ پر لکھا، دو-تین روز بعد راقم استاد محترم پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی آپ علوی صاحب پر ایک مضمون عنایت کردیں۔ انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ-تم نے میرے دل کی بات کہہ دی- ہمارے یہاں لوگ جب تک زندہ رہتے ہیں ان کی قدر نہیں ہوتی لیکن ڈاکٹر ابوسفیان صاحب کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے کہ وہ عرب دنیا کی طرح زندہ لوگوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا کرتے ہیں، ان کے خاکوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ہم ان کے بے حد ممنون و مشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر یہ مضمون عنایت کیا، جو اگرچہ پروفیسر رفیع احمد علوی مرحوم کی شخصیت و خدمات کا احاطہ نہیں کرتا مگر ان کی شخصیت کے خوبصورت و قابل تقلید پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔

میرا ان سے نومبر ۲۰۰۸ میں ''ندائے اعتدال'' کے اجراء کے وقت تعلق ہوا، وہ مسلسل اس کی مجلس ادارت میں شامل رہے، ابتدا میں اپنے قیمتی مضامین سے اس کے معیار کا تعین اور وقار میں اضافہ کیا، ''تاریخ کے جھروکوں سے'' معنون کالم میں بیش قیمت مضامین لکھتے رہے، کچھ عرصہ بعد بعض علمی کاموں کے سبب پھر اصلاحی رسائل کی تالیف و اشاعت اور بدست خود تقسیم کی بڑھتی دلچسپی اور آخری ۲ سال علالت کے سبب یہ سلسلہ رک سا گیا، لیکن وہ مسلسل اس کو پڑھتے رہے اور ایسے پڑھتے کہ صفحہ اول سے آخر تک رسالہ موصول ہونے کے دو-تین بعد پڑھتے اور پھر صحیح و غلط، خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کرتے، ان میں بڑکپن، خوردنوازی، اخلاص وللّٰہیت اور حسن اخلاق جس قدر موجود تھا وہ اب تو بہر حال عنقاء نظر آتا ہے، ڈاکٹر ابوسفیان صاحب کے مضمون کے ساتھ حواشی میں ہم کچھ اس طرح کی اور باتیں شامل کردیں گے جن کا افادہ عام کی غرض سے منظر عام پر آنا ضروری ہے۔ (مدیر)

انسان اپنے کردار، حسن اخلاق اور خوش گفتاری سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے، اس کے پس پشت یا آسودہ خاک ہونے کے بعد عامۃ الناس اس کی خوبیوں کی وجہ سے اس کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی اس کے محاسن و مفاخر اسے مرنے نہیں دیتے۔ ''کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' ہی حقیقی تعارف ہے۔ پروفیسر رفیع احمد علوی (پ:۱۲/جولائی ۱۹۴۲ء) ۲۲/اپریل ۲۰۱۵ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آج خلق خدا اس کی تعریف و توصیف میں محو ہے۔ انکساری، دست گیری اور ملی فکرمندی آپ کی ذات گرامی کے امتیازات تھے۔ تبادلہ خیال، مطالعے کا شوق، نئی مطبوعات کے شیدائی اور کتب خانوں کے طواف ہی ان کے اشغال تھے۔ یہ سب کھیکڑ وہی پالتا ہے جسے تحقیق و تفتیش سے عشق ہو، یقیناً وہ علم کے سچے عاشق تھے، جنھیں دیکھ کر رشک آئے۔

تھے تاریخ کے استاذ لیکن ادھر اسلامیات آپ کا اساسی نکتہ خیال بن چکا تھا، لیکن یہ نکتہ خیال استثراقی ہرگز نہ تھا آپ کے مطالعہ اسلامیات کا تعلق اخلاص اور تدین سے تھا۔ صاحبان اسلام کی ایک بڑی تعداد ہے جو قلم وقرطاس کو بلندیٔ منصب کے لیے پکڑتی ہے یا دانش وروں میں مقام خاص پر فائز ہونے کے لیے تاکہ انھیں ایک معروف محقق اور قابل ذکر مفکر کہا جائے۔ ایسے اغراض پسند لوگوں کے لیے حسن النباء نے کہا تھا "وھم یصنفون الکتاب انا اصنف الرجال" (اور وہ کتابیں تصنیف کرتے ہیں اور میں انسان تصنیف کرتا ہوں) یہی وجہ ہے کہ آج ارباب علم کی تحریریں یا علماء کرام کی تقریریں تاثیر سے خالی ہیں۔ اسلامیات پر ہزاروں کتابیں لکھی جارہی ہیں اور صدہا تقاریر کی جارہی ہیں لیکن امت میں کوئی بدلاؤ نہیں۔ وہی انتشار، وہی انحطاط اور وہی باہمی رنجشوں کا سلسلہ درسلسلہ۔ پروفیسر علوی صاحب کے لیے یہ ملی بکھراؤ عذاب الیم سے کم نہ تھا۔ اسی عذاب میں گھلتے پگھلتے اور کروٹیں بدلتے، اکثر خاکسار کے کمرے میں آتے، خوبصورت بریف کے ساتھ تبسم ریز ہوتے، ایسے ظریف کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور پھر اپنے اصل موضوع پر آجاتے کہ کس طرح امت مسلمہ کی فرقہ بندیوں کو ختم کیا جائے۔ علوی صاحب کو شرک سے انتہائی نفرت تھی۔ کیونکہ یہی تو علامت ایمان ہے۔ جسے مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے دو رسالوں (۱) حقیقت شرک اور (۲) حقیقت توحید میں بڑے سلیقے سے موضوع بحث بنایا ہے۔

پروفیسر علوی صاحب اکثر قبر پرستی سے متعلق اپنے دکھ درد کا اظہار کرتے، کیوں کہ یہ چیز ان کے لیے ناسور تھی، کیوں کہ عرس کے نام پر امت کا خاصہ پیسہ برباد ہورہا ہے۔ اگر امت ان مسائل سے خود کو آزاد کرلے تو بہت سی مشکلات اس کی خود دور ہوسکتی ہیں۔ لیکن وہ اس طرح کے حساس موضوعات پر حکمت سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس کا وہ ایک غیر مجادلانہ حل چاہتے تھے۔ کیوں کہ مسائل مجادلے اور مناظرے سے حل نہیں ہوتے۔ قرآن کریم میں یہی نکتہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: "قل یأھل الکتٰب تعالوا الٰی کلمة سواء بیننا وبینکمالا نعبد إلا اللہ" (آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔) اس آیت کریمہ میں تقابل ادیان کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز دیگر اقوام کے ساتھ تحمل کے ساتھ مباحثہ و مذاکرہ کا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ گویا اسلام میں مخاصمت ومحاربت کا تصور ہی نہیں ہے چہ جائے کہ باہمی خون ریزی کا ہم شکار ہوں۔ اس وقت ہماری یونیورسٹی بھی مسلکیت کا شکار ہے۔ خدا اس فتنے سے ادارۂ سرسید کو محفوظ رکھے۔ سرسید نے یہ ادارہ امت کے تمام فرقوں کے لیے بنایا تھا بلکہ اس کے توسط سے اسے جوڑنے کے خواہاں تھے۔ پروفیسر علوی اکثر اس کا ذکر کرتے۔ اسلامیات سرسید سے انھیں شدید اختلاف تھا لیکن ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے دل سے قدرداں تھے۔ آپ کی اس قدردانی کے ماوراء جذبہ اخلاص اور ملی محبت موجزن تھی۔ پروفیسر علوی کی فکرمندی بھی انھیں رہ رہ کر ستاتی رہتی۔ کہ علی گڑھ میں ایک ایسا دینی مدرسہ ہو جو یہاں کے مسلم بچوں کی دینی اور فکری نیز توحیدی تربیت کرسکے۔ محترم ڈاکٹر غیاث لدین ندوی کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے قیام سے حد درجہ خوش تھے۔ اکثر اس کی تعمیر وترقی کی باتیں کرتے، اس کی اعانت کے لیے عوام الناس کو اکساتے۔ بارہا خاکسار کو بھی اس کی جانب متوجہ کیا، مرحوم علوی صاحب کی اس مدرسہ سے محبت کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے اسّی گز کا ایک پلاٹ خرید کر اس مدرسہ کو دیا۔ یہ چیز

ان کے اندرونی تدین پر دال ہے۔ مزید زمینیں بھی خرید کر اس ادارے کو دینے کا عزم صمیم کر چکے تھے کہ بلاوا آ گیا۔(☆) مرحوم بڑے حوصلوں کے مالک تھے۔ سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے لیکن آواز میں وہی کڑک اور سروں میں وہی کھنک۔ کانپور علاج کے لیے گئے۔ اکثر فون پر باتیں کرتے۔ علمی مباحث چھیڑتے۔ اشعار پڑھتے اور لفظوں کے تہہ میں اترنے کی کوشش کرتے۔ شاید یہ حقیقت ہے کہ آخری دنوں تک ورق گردانی کرتے رہے۔ یہی حال تو ہمارے افغانی کا تھا جو سرطان ہی کا شکار تھے۔ لیکن حوصلے اور فکری بلندیاں انھیں چلاتی رہیں اور انگریزوں سے لڑنے کا انھیں گر سکھاتی رہیں۔

مرحوم دریائے علم کے سچے شناور تھے۔ کیوں کہ بارہ بنکی سے تعلق تھا جس کے خمیر میں ادب وانشاء تھا۔ یہ اودھ کے وہ نواحی علاقے ہیں جہاں سے عظیم المرتبت ادباء اور جلیل القدر شعراء نے اردو ادب کو شادابی عطا کی۔ آج کے شیدائیان علم کتابوں اور رسالوں کے نام پر ایک حبہ بھی جیب سے نکالنے کو تیار نہیں۔ مرحوم اس کے برعکس تھے۔ کانفرنس گزٹ، تہذیب الاخلاق، فکر ونظر اور معارف کے خریدار تھے۔ (☆☆) ان رسالوں کی ایک ایک سطر پڑھتے۔ مقالہ نگاران یا صاحبان علم سے تبادلہ خیال کرتے۔ یہ خاکسار کے لیے باعث افتخار ہے کہ اس کے مضامین پڑھتے، الفاظ کے استعمال پر گفتگو کرتے، اصلاحات کرتے، لغات اور دواوین سے مثالیں پیش کرتے، اور مدلل گفتگو کے عادی تھے۔ ادب، شاعری، تحقیق اور تاریخ ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ اکثر تحقیق میں خاکسار کو چت کر دیتے۔ یہ ادبی معرکہ آرائیاں کتنی حسین تھیں۔ پرتہ خاک ہوئیں، آنکھیں اس حسین شخص پر اشکبار ہیں جو غم خوار اور بڑا دلدار تھا۔ چلتے ہوئے مسکراہٹیں لٹانا، مسرتیں بانٹنا اور مایوسیوں کو قریب نہ آنے دینا اس کا شیوہ حیات تھا، بات چل رہی تھی رسائل کی خریداری کی۔ اسی طرح مرحوم نئی مطبوعات کا اشتہار دیکھتے ہی بے قرار ہو جاتے، ان کے حصول کے لیے مختلف اہل علم سے رابطہ کرتے، محترم اسلام عمری صاحب ان کی اس جنونی کیفیت کا بہتر حال جانتے ہیں۔ کیوں کہ مرحوم کی اس علمی خواہش کی تکمیل کا اکثر سبب وہی بنتے تھے۔ مصنفین اور مؤلفین سے بھی ان کی تازہ تصانیف کے حصول کے لیے ان سے درخواست کرتے اس لیے نہیں کہ وہ انھیں مفت تھمادیں بلکہ انتہائی اصرار کے باوجود بھی مفت خوانی کے لیے تیار نہ ہوتے۔ (☆☆☆) بہر حال بصورت نقد حاصل

(☆) بالکل بجا فرمایا ڈاکٹر صاحب نے، مدرسہ کی موجودہ عمارت جس زمین پر ہے اس میں ۸۰ گز زمین خرید کر مرحوم نے دی تھی، اور ایک پلاٹ غالباً ۳۰۰ گز کا خرید کر ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی اور پروفیسر مسعود خالد صاحبان کو لے جا کر دکھایا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ یہ آپ کے مدرسہ کے لئے ہے لیکن میرے بعد، بعد میں کیا ہوا واللہ اعلم، اسی طرح انہوں نے اپنے ذخیرہ کتب کے لئے بارہا ان صاحبان اور خود راقم سے فرمایا کہ میں اپنے بعد یہ کتب مدرسہ کے مکتبہ ابوالحسن کو دے دوں گا، وہ اکثر خود کچھ نہ کچھ تعاون کرتے اور دوسروں کو متوجہ کرتے، راقم شاہد ہے کہ بعض لوگوں کا زر مبادلہ خود جمع کر کے ان کے لیے ندائے اعتدال جاری کرایا۔ (طارق)

(☆☆) ان کے علاوہ بھی رسائل خریدتے تھے، ندائے اعتدال کے ورز اول سے خریدار تھے، بلکہ خریدار بناتے بھی تھے اور بعض کا زر مبادلہ بھی خود ادا کرتے، جس انہماک سے پڑھتے تھے اور پھر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے، اصلاح وحوصلہ افزائی کرتے تھے وہ یقیناً قابل تقلید وباعث رشک ہے (طارق)

(☆☆☆) راقم اور راقم کی تصنیفات کیا، لیکن کبھی ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہ ہوئے، فروری میں عالمی کانفرنس کے موقع پر وہ کانپور میں زیر علاج تھے،<<<

کر کے ان کا مطالعہ کرتے۔ یہ بھی قابل ذکر اور قابل رشک دونوں ہے کہ ادھر دو چار سالوں سے چھوٹے چھوٹے دینی، اصلاحی اور معاشرتی کتابچے ذاتی صرفہ پر شائع کراتے اور مختلف مساجد میں جا کر بدست خود تقسیم کرتے۔ آپ کے اس عمل سے آپ کے دینی جذبات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ منٹوئی میں تدفین سے قبل ادارہ سرسید کے اساتذہ کرام آپ کے اس حسن عمل کی سراہنا کر رہے تھے۔ یقیناً یہ کتابچے نئی تعلیم کے حاملین کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ اپنی اس دینی جتن سے وہ لوگوں کے اندر تصور آخرت جگانا چاہتے تھے۔ انھیں دین اسلام سے قریب کرنے کے تمنائی تھے۔ اس میں بہت سے واقعات نقل کر کے صاحبان اسلام کے دلوں میں انابت انڈیلنے کے لیے کوشاں رہتے۔ ایک کتابچہ تو بہت ہی کارآمد تھا جس میں ادائیگی نماز کے طریقے بتائے گئے تھے اور ان طریقوں کی وضاحت تصاویر سے کی گئی ہے۔(☆) مرحوم علوی صاحب تاریخ کے آدمی تھے۔ تاریخ میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے اس پر کچھ کہنے کا مجھے جواز نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مطالعہ اسلامیات سے آپ کو شغف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ زمزم پر آپ کا مقالہ خاصا معلوماتی ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر بعض دیگر زبانوں میں بھی اسے منتقل کیا گیا۔(☆☆)

<<<اس وقت ۴ کتابیں منظر عام پر آئیں، غالباً مارچ یا اپریل کے ندائے اعتدال میں ان کا اشتہار تھا، وہ موذی و مہلک مرض میں مبتلا تھے لیکن جیسے ہی علی گڑھ پہنچے آمد کی اطلاع دی اور حکم صادر کیا کہ یہ کتابیں قیمتاً مجھے بھجوا دیں، راقم نے عرض کیا کہ ایک سیٹ تو آپ کے لئے ہدیہ رکھا ہی ہے، فرمایا ''نا بھائی نا'' یہ ممکن نہیں، حیرت اس پر کہ اس قدر تکالیف کے بعد بھی ایک ہفتہ بعد فون کیا اور فرمایا کہ بھائی آپ کی کتاب ''مفکر اسلام ایک مطالعہ'' پڑھ لی، پروف کی غلطیوں نے طبیعت مکدر کی لیکن یہ آپ نے بڑی مفید اور کام کی چیز تیار کر دی، مزید باتیں کیں اور بہت دعائیں دیں)

(☆) ان کتابچوں کی تعداد کوئی ۱۰ کے قریب ہوگی، آخری سالوں میں یہی ان کی دلچسپی کا باعث تھے، اپنی چیزیں اور کسی بھی شخص کی کوئی مفید چیز ہاتھ آتی تو اسے فوراً شائع کرتے اور تقسیم کرتے، بسا اوقات کسی کا کوئی مفید مضمون پڑھتے تو اسے سینکڑوں کی تعداد میں فوٹو کاپی کرا کر تقسیم کرتے، ان کی علم دوستی اور اصلاح معاشرہ اور اسلام پر اعتماد کی بحالی کی فکر مندی کے لئے ان کا جذبہ قابل قدر تھا، انتقال سے کوئی دو ماہ قبل محسن عثمانی صاحب کی ایک کتاب پڑھی اور بس اس کے انگریزی ترجمہ کے لئے کوشاں ہو گئے، مجھ سے مصنف سے اور پروفیسر قدوائی صاحب سے رابطہ کیا اور پھر حالات کی ناسازگاری کے باعث حسرت کے ساتھ خاموش ہو کر بیٹھ گئے)

(☆☆) یہ مقالہ ندائے اعتدال کے لیے تحریر فرمایا تھا اور اسی میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، اسی زمانے میں تھائی لینڈ سے حافظ شوکت صاحب آئے تھے انہوں نے ہی کہا تھا کہ ہم اس کا تھائی اور بعض دوسری زبانوں میں ترجمہ کریں گے، ایک عرصہ بعد فون پر انہوں نے تھائی اور برمی زبان میں ترجمہ کے مکمل ہونے کا ذکر کیا، واللہ اعلم، واقعی اس وقت انہوں نے ندائے اعتدال میں جو مقالات تحریر کیے وہ ان کی علم دوستی، سیرت سے عشق، صحیح الفکری اور علمی لگن کے غماز ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ندائے اعتدال میں ان کے شائع شدہ مقالات کی یہاں تفصیل درج کر دوں:

۱۔ حرب الفجار، ص ۲۱-۲۳، ج ۱ (الف) (یہ ندائے اعتدال کی ابتدائی جلد تھی جب وہ اعتدال کے نام سے نکلا تھا پھر سرکاری رجسٹریشن نے نام تبدیل کر دیا، جلد نمبر ا کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا) شمارہ ۳، جنوری ۲۰۰۹ء

۲۔ حلف الفضول، ص ۱۲-۱۶، شمارہ ۴، فروری ۲۰۰۹ء

۳۔ صادق و امین تاجر، ص ۱۴-۱۴۱، شمارہ ۵، مارچ ۲۰۰۹ء

اس تعلق سے سرسید نے بھی آب زمزم پر عالمانہ اظہار کیا ہے۔ پروفیسر علوی نے آب زمزم کا اسلامی مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا سائنسی مطالعہ بھی پیش کیا ہے نیز مغربی اسکالرز کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ یہ تمام چیزیں دال ہیں کہ پروفیسر علوی کا مزاج اسلامی اور علمی تھا۔ اسی اسلامی مزاج نے انھیں جماعت تبلیغی سے وابستہ کیا۔ یہ وابستگی ایسی سچی تھی کہ اپنی کار بھی تبلیغی جماعت کے کاموں کے لیے بے دریغ استعمال کرتے اور کبھی کبھی جماعتی حضرات کو اِس مسجد سے اُس مسجد منتقل کرتے، ان تمام تر کارفرمائیوں کے پیچھے محض آپ کا جذبہ اسلامی کارفرما تھا۔ وہ جماعت کے ایسے فدائی بن چکے تھے کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی انھیں سننا گوارا نہ تھا۔ علوی صاحب کے اس تدین اور اتقاء کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے کہ نماز باجماعت کے نہ صرف پابند بلکہ انتہائی پابند، ان کی اس مواظبت سے قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ سامنے آتی ہے۔ حافظوا علی الصلوات والصلواۃ الوسطی وقوموا للہ قانتین " (اپنی نمازوں کی نگہہ داشت رکھو، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوۃ کی جامع ہو، اللہ کے آگے اسی طرح کھڑے رہو جیسے فرمانبردار غلام کھڑے رہتے ہیں) (البقرہ:۲/۲۳۸)۔ ادھر کئی سالوں سے شدید بیماری کے باوجود مسجد میں باجماعت ادائیگی کے لیے بہرحال جاتے۔ چلچلاتی دھوپ، سخت سردی اور باد وباراں ان کی راہ کا روڑہ نہ بنتیں۔ "انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ" کا ایک زندہ نمونہ تھے۔

پروفیسر علوی صاحب ایک استاذ تھے، استاذ کے فرائض بڑے عظیم ہوتے ہیں اس کی عظمت کا ایک نشان یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے محبت کرتے، ان کے تلامذہ گواہ ہیں کہ وہ ہمیشہ ان کی محبتوں سے سرشار رہتے۔ اپنے تلامذہ کی ضیافت میں ان کا دست

۴۔ رسول اکرم اور حضرت خدیجہ کی شادی، ص۶-۱۷، شمارہ۶، ۱/اپریل ۲۰۰۹ء

۵۔ دوسری قسط، ص۸-۱۲، شمارہ۷، مئی ۲۰۰۹ء

۶۔ چاہ زمزم، ص۹-۲۴، شمارہ۸، جون ۲۰۰۹ء

۷۔ آب زمزم اور نبی پاک کی صداقت، ص۷-۱۵، ج۱(ب)، شمارہ۱، جولائی ۲۰۰۹ء

۸۔ دوسری قسط، ص۷-۲۳، ج۱، شمارہ۲، اگست ۲۰۰۹ء

۹۔ شوال کے چھ روزے، ص۶۹-۷۰، ج۱، شمارہ۳-۴، ستمبر اکتوبر ۲۰۰۹ء

۱۰۔ خطبہ حجۃ الوداع کی تاریخی اہمیت، ص۶۹-۷۰، ج۱، شمارہ۷، جنوری ۲۰۱۰ء

۱۱۔ دوسری قسط، ص۱۰-۳۱، ج۱، شمارہ۱۰، اپریل ۲۰۱۰ء

۱۲۔ تیسری قسط، ص۸-۲۴، ج۱، شمارہ۱۱، مئی ۲۰۱۰ء

۱۳۔ خطبہ حجۃ الوداع اور مغربی دساتیر، ص۷-۱۷، ج۱، شمارہ۱۲، جون ۲۰۱۰ء

۱۴۔ عیدالفطر سنتوں کے آئینہ میں، ص۲۲-۲۳، ج۲، شمارہ۳-۴، ستمبر اکتوبر ۲۰۱۰ء

۱۵۔ خطبہ حجۃ الوداع اور مغربی دساتیر کا موازنہ، ص۳۳-۴۰، ج۲، شمارہ۸-۹، فروری مارچ ۲۰۱۱ء

یہ قیمتی اور تحقیقی مضامین ندائے اعتدال کے صفحات کی زینت بنے، اس کے بعد جو مضامین شائع ہوئے وہ سب اصلاح معاشرہ سے متعلق تھے، ان میں ایک مضمون "Days" اور ہم مسلمان" بڑا اہم تھا جو اکتوبر ۲۰۱۱ء ج۳، شمارہ۴، میں شائع ہوا، (مدیر)

سخاوت ہمیشہ متحرک رہتا۔ ان کا بیگ پھلوں اور مٹھائیوں سے لبالب اور لدالد ہوتا، تاکہ تلامذہ نوازی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ ہمارے یہاں ان کی ایک تلمیذہ رہائش پذیر تھیں، وہاں بھی لدے لدائے آتے۔(☆) خاکسار کی بارہا ان کے گھر پر حاضری رہی اور خاکسار کی حاضری کے لیے اصرار کرتے۔ پھلوں اور مٹھائیوں سے خوان نعمت بھر دیتے۔ چاقو سنبھال کر قاش در قاش پیش کرتے رہتے۔ ان کی یہ چاہت اور ان کا یہ اصرار پھلوں کی لذت کو دوبالا کر دیتا۔ یہی تو اسلام اور علامتِ ایمان ہے۔ کبھی کبھی میں آپ کے اصرار والحاح سے حاضر ہوتا تو ان کی خوشیوں کا عالم عجیب ہوتا، ایسا بھاگ بھاگ کر چیزیں لاتے کہ گر جانے کا گمان ہوتا۔ یہ بھی آپ کی عظمت تھی کہ دوسروں کی رائی بھر کی خدمت کو پہاڑ بنا کر پیش کرتے۔ ایک بار خاکسار کے حقیر خانے پر کباب کیا تناول کیے کہ اس کا اشتہار کرتے پھرتے، مختلف انداز سے اسے سراہتے، بس یوں جانیے کہ قرینہ محبت کا دوسرا نام پروفیسر رفیع احمد علوی تھا۔ علوی خود ایک ایسا حسین انتساب ہے کہ جس سے رنگوں کی بارش اور حسن و جمال کی غمازی ہوتی ہے۔ تھے شوگر کے مریض لیکن برق رفتاری اور تبسم ریزی میں کبھی کوئی فرق آجائے یہ ممکن نہیں۔ ہمیشہ ڈگ بھرتے ہوئے دوسرے تیسرے دن شعبہ عربی اور شعبہ اسلامیات کی لائبریری میں آجاتے۔ گھنٹوں گھنٹوں کام کرتے، لیکن یہ مصروفیات انھیں رفیق حیات سے غافل کر دیں یہ ممکن نہیں۔ تہہ آزار تھے لیکن رفیق حیات کی آزاری انھیں ہرگز پسند نہ تھی۔ گھڑی پر نگاہ رہتی کہ رفیقہ حیات کا بلڈ ٹسٹ کب ہونا ہے ؟انھیں اسپتال کب جانا ہے؟ کالج انھیں کب چھوڑنا ہے اور وہاں سے کب لینا ہے؟ یہ تمام ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دیتے، افسوس کہ گھر میں چہکنے والا، گھر سر پر اٹھانے والا اور اس میں بے ترتیبی پھیلانے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن بیس سالہ پیہم ملاقاتوں میں کبھی بھی اس کا ذکر نہ آیا۔ یہ انتہائی شکر گزار بندے کی پہچان ہے۔ ورنہ یہ عجلت پسند انسان زیبائشِ مکان نہ ہونے پر گھر اٹھالیتا ہے۔ تنگیٔ زمین ہم سفر بن جاتی ہے اور اپنی محرومی پر آنسو بہاتا ہے اسی طرح اگر اس کے حصہ میں سب لڑکیاں ہیں تو وہ بھی اسے اپنی شومئ قسمت تصور کرتا ہے۔ یہ سب ہندوانہ اور کافرانہ تہذیب ہے۔ جس کی تصویر کشی قرآن کریم میں یوں کی گئی ہے۔ ''وإذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھہ مسوداً وھو کظیم''(ان میں سے جب کسی کو لڑکی ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔) یہ دراصل دور جاہلیت کی داستان ہے، جہاں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ آج کا یہ جدید معاشرہ بھی عربوں کے اسی غیر عادلانہ اور بہیمانہ ڈگر پر قائم ہے۔ یہ انسان اس وقت بھی اسی صنفی امتیاز کا شکار ہے۔

علوی صاحب ایک انسان دوست آدمی تھے، شاگرد نوازی اور انسان دوستی ان کی رگ میں موجزن تھی۔ ان کے احباب بخوبی جانتے ہیں کہ وہ انھیں اکثر احادیث اور ناصحانہ اشعار فریم کروا کر ہدیتاً پیش کرتے۔ نہ جانے کتنے گھروں میں ان کی یہ یادگاریں آویزاں ہیں۔ خاصے روپے اس پر صرف کرتے۔ فریموں کے مضامین ان کی ذہنی رجحان کے غماز ہیں کہ ان کی ہر وابستگی کا ڈانڈا

(☆) انہوں نے شعبۂ تاریخ میں آخری جس بیچ کو پڑھایا تھا اس بیچ کے ایک طالب علم ہمارے سینیر ہاسٹل فیلو تھے، ان کو جب مرحوم سے ہمارے تعلق کا علم ہوا تو ان کی خصوصیات وقتاً فوقتاً ہم سے بھی بیان کرتے، بڑی تعریفیں کرتے، جس دن انتقال ہوا اسی دن بتایا کہ جب یہ ہم لوگوں کی ایکسٹرا کلاس لینے آتے تو گاڑی میں پھل اور اچھی مٹھائیاں وغیرہ ہم طلبہ کے لئے لاتے، پہلے پڑھاتے پھر کھلاتے اور بڑی خوش مزاجی کے ساتھ رخصت ہو جاتے۔ (طارق)

اسلام سے ملتا ہے اکثر قرآن کریم اور احادیث شریفہ کے مفردات کو موضوع بحث بناتے۔ اس کی ایک ایک نوک اور پلک کی تشریح میں کھو جاتے اس کے لیے اکثر ان کے فون آتے اور علمی مسائل پر طویل گفتگو کرتے۔ لسانیات آپ کا پسندیدہ موضوع تھی۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے بالخصوص انگریزی پر اچھی دسترس تھی، خوبصورت انگریزی لکھتے، جس کی شہادت کے لیے حیاتِ جاوید کا ترجمہ کافی ہے۔ عربی صرف کام چلاؤ تھی۔ وہ اہل علم کے قدرداں تھے۔ اکثر جامعہ اسلامیہ میں اہل علم اساتذہ کرام پر ہونے والی زیادتیوں پر اپنے کرب و درد کا اظہار کرتے۔ خاکسار کی ترقی جب بہت دنوں تک رکی رہی تو اس پر اکثر اظہار افسوس کرتے یقیناً خدا ان کے درجات بلند کرے گا۔ کاش آپ کی رقیق القلبی کے کچھ حصے ہم سنگ دلوں کے حصہ میں آجاتے۔ یہ سچ ہے کہ ''رحماء بینھم ''کی ایک تصویر پروفیسر علوی بھی تھے۔

یہ بات اوپر آچکی ہے کہ وہ کتابوں کے حد درجہ شوقین تھے، ہر وقت کتابوں کے پیچھے بھاگتے رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ ان کے گھر کو اگر ''بیت الجاحظ'' کا نام دیا جائے تو انسب ہوگا۔ شاید اس میں مبالغہ نہیں کہ علی گڑھ کا یہ وہ قطعہ ہے جو ''نظامی ولا'' سے موسوم ہے۔ یہ ولا نہیں بلکہ ''دارالعلم'' ہے۔ یا علی گڑھ کا بیت الحکمت، یہاں سے علم کی ہوائیں چلتی ہیں جو ارباب علم وفن کو معطر کردیتی ہیں۔ اور کشت ادب کو شاداب کردیتی ہیں۔ علوی صاحب کا پورا گھر کتابوں سے مملوء ہے۔ الماریاں جب کچھا کھچ ہوگئیں تو کتابیں میزوں کی زینت بننے لگیں ایک طرف علوی صاحب کی کتابوں کی جلوہ آرائیاں تو دوسری طرف معروف مؤرخ اور اسلامی مصنف پروفیسر خلیق احمد نظامی کا کتب خانہ جو تصوف لٹریچر میں اپنی مثال آپ ہے۔ شاید ہندوستان میں اس کی مثال نہ لائی جاسکے۔ نظامی ولا ایک طرف جہاں کتابوں کا جنگل یا برٹش میوزیم ہے وہیں یہ ولا درس وتدریس اور تحقیق وتصنیف میں امتیازی شان کا حامل بھی ہے۔ پروفیسر نظامی نے اپنی تدریسی اور تحقیقی خدمات سے یونیورسٹی کے وقار کو بلند کیا۔ آپ کے تین بیٹوں پروفیسر احتشام نظامی، پروفیسر وجیہہ احمد نظامی اور فرحان نظامی نے علم وفن کی دنیا کو سنوارنے میں گراں قدر رول ادا کیا۔

''خلیق احمد نظامی مرکز برائے علوم القرآن'' فرحان نظامی نے قائم کرکے ادارہ سرسید کی تعمیر وترقی میں ایک نئی جہت دے ڈالی۔ مرحوم نظامی صاحب کے دو بھائیوں مرحوم ظل احمد نظامی نے کراچی میں سرسید انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کی تاسیس سے علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھایا اور پروفیسر توفیق نظامی نے علم سیاست میں اپنی ایک شناخت بنانے میں محنت شاقہ کا ثبوت دیا۔ اس تفصیل میں جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قارئین کو بتایا جائے کہ پروفیسر علوی صاحب ایک ایسی فضا میں سانس لے رہے تھے جہاں تحقیق وتفتیش کی بالادستی ہے۔ لاریب صاحبانِ نظامی نے دنیائے قلم وقرطاس کو اعتبار واستناد بخشا۔

اب علوی صاحب کی کچھ تحقیقی فتوحات کا تذکرہ کیا جائے گا۔ پروفیسر علوی کا سرسید اور تحریک سرسید سے ایک جذباتی تعلق تھا۔ ان کی اسی والہانہ تعلق نے انھیں مہمیز کیا کہ وہ مولانا الطاف حسین حالی کی معروف کتاب ''حیاتِ جاوید'' کو انگریزی میں منتقل کریں۔ ترجمہ خاکسار کے نزدیک تصنیف سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ بہر کیف اس امر دشوار (Painful Work) کو بحسن وخوبی پائے تکمیل کو پہنچایا۔ امر دشوار اس لیے کہ مترجم کے سامنے ایک تو ترجمہ اور دوسرے مؤلف کی روح کی منتقلی جو ایک کٹھن کام ہے۔ زبان آنا اور ہے اور روح زبان میں اترنا کار دیگر است۔ حیاتِ جاوید کے ترجمہ سے مترشح ہے کہ علوی صاحب زبان داں اور عارف روح

دونوں تھے۔ ان کی اسی عارفیت اور زبان دانی نے حیاتِ جاوید کو خوبصورت جامۂ انگریزی میں ملبوس کیا گیا۔ اس ترجمہ کو درجہ استناد اس لیے حاصل ہے کہ قابلِ احترام پروفیسر مسعود الحسن اور پروفیسر وقار حسین کی نظر ثانی کے بعد آیا ہے۔ پروفیسر مسعود الحسن کی نفاست اور ادبی لطافت سے کون واقف نہیں؟ اس سے پہلے ڈاکٹر ایچ قادری اور ڈاکٹر ڈیوڈ، جے میتھیوز پہلے حصے کا ترجمہ کر چکے تھے اور بعض موانع کے سبب یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ دونوں مترجمین کے سامنے حیات جاوید کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ جس میں کچھ خامیاں تھیں۔ علوی صاحب نے اپنا ترجمہ پہلے ایڈیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو نبھایا۔ بہر کیف یہ ایک بڑا کام ہے اس کام کی وجہ سے پروفیسر علوی کو فراموش کرنا آسان نہ ہوگا۔ اس کتاب کے اخیر میں اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ جو اسماء، اماکن اور اداروں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں فرہنگ اور مراجع کی فہرست بھی ہے۔ یہ کام دراصل علی گڑھ تحریک کا ایک زریں سلسلہ ہے۔ خاکسار کو یہ ترجمہ مرحوم نے تحفتاً پیش بھی کیا تھا۔ اللہ ایسے مترجمین کو پیدا کرتا رہے جو علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھاتے رہیں۔ ہم شکر گزار ہیں پروفیسر محمد صلاح الدین عمری کے جنھوں نے عربی میں حیاتِ سرسید ترتیب دے کر اور سرسید کے مقالات کو دو جلدوں میں منتقل کر کے ملت پر احسان کیا ہے۔ اللہ اس قابل قدر سلسلے کو دراز کرے۔

پروفیسر علوی کے مضامین کا ایک مجموعہ Studies in th History of Modern Deccan" کے عنوان سے ہے جو چھ مقالات پر مشتمل ہے:

(1) Religion and Politics in Ahmadnagar Kingdom.

(2) Evidence on the last Years of Jahahgir's Reign in the Anfa-ul-Akhbar

(3) New Light on Mughal Cavalry.

(4) Murshid Quli Khan's Revenue Reforms in the Deccan.

(5) Some Aspects of Provincial Adminisration in the Deccan during Shah Jahan's Reign.

(6) Working of the postal and intelligence services in Mughal Deccan.

مذکورہ مقالات ریسرچ پیپرز ہیں اس سے ان کے ذہن رسا کا اندازہ لگانا دشوار نہیں گو کہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔ اگر لکھتے تو مزید تحقیقی سنگہائے میل قائم کرتے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ایک استاذ کا فریضہ یہ ہے کہ تحقیق سے پیمانِ وفا باندھے، کیوں کہ تحقیق اور تدریس ساتھ ساتھ چلتی ہیں، تدریس دراصل تحقیق ہی سے نکھرتی اور درجہ اعتبار حاصل کرتی ہے۔ بہر کیف یہ مقالات عہد وسطیٰ کے دکن کے بہت سے گوشوں کی تفہیم میں معاون ہیں۔ ان مقالات میں مغلوں کی تصاویر بھی موجود ہیں کہ دکن کے حوالے سے ان کی کیا خدمات رہی ہیں؟ مغل پیریڈ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک مفید ہدیہ ہے۔ آخر میں اسماء، اماکن اور اداروں کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ جس کی وجہ سے افادیت کتاب سوا ہو جاتی ہے۔ یہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۹ء میں ادارہ ادبیات دلی سے شائع ہوئی۔ آپ نے کچھ مقالات بھی تحریر کیے ہیں جن میں سے تین مقالات اس طرح ہیں:

(1) Evidence on the last year of Jahangir's reign in the Anfa-ul-Akhbar

(2) Evidence on the last Years of

(2) Mughal Geographical Accounts of Khandesh Med. I. Miscellany, Vol-3

(3) Persian Influences & the development of Shisn in the Bahmani Kingdom

پروفیسر علوی صاحب کو ایک استاذ، بلند پایہ انسان اور اسلام پسند کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے ۔ مذکورہ تینوں اوصاف ان کی شخصیت کے امتیازی عناصر تھے۔ طبیعت میں استغناء اور کبر سے اجتناب تھا۔ انھیں دیکھ کر خوش ہوجانا فطری امر تھا۔ یہی کشش تھی کہ خاکسار جب ان کے مکان سے گزرتا تو دل دستک دینے پر مجبور کرتا۔ اکثر دل کے حکم پر سپر ڈال ہی دیتا تو وہی ان کا طرہ امتیاز رد یکھنے کو ملتا، پلانے اور کھلانے کا سلسلۂ دراز شروع ہوجاتا، لیکن بزم مے میں صرف علمی گفتگو کا ہی گزر رہوتا، کتابوں کا ذکر اور ان کی دستیابی کے طریقے موضوع بحث ہوتے۔ علوی صاحب علی گڑھ کے فاضل اساتذہ کرام پر اظہار خیال کرتے لیکن خالی خولی نہیں بلکہ ان کے خیالات کے تناظر اور ان کی نگارشات کی روشنی میں۔ ادارۂ سرسید سے منظر عام پر آنے والا اکثر لٹریچر آپ کی نظر سے گزر چکا تھا۔ کیوں کہ آپ کی مشغولیات کی دو جہتیں تھیں ایک رفیقۂ حیات اور دوسرے کتابیں جنھیں متنبّی نے ''خیر الجلیس'' یعنی بہترین رفیقۂ حیات قرار دیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جو کتابوں سے محبت کرتا ہے اور انھیں اپنا محسن تصور کرتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کا سب سے بڑا محسن ''فرقان حمید'' تھا اگر سارے انسان اسی کو اپنا محسن بنالیں تو دنیا کی بے قراریاں اور دنیاے انسانیت کی فرقہ واریاں کافور ہوجائیں۔ علوی صاحب اکثر قرآن کریم کی آیات کے مفاہیم ومطالب کے سلسلے میں خاکسار سے سوالات کرتے اور کبھی کبھی میرے مضمون میں منقولہ آیاتِ کریمہ کے تناظر سے اختلاف بھی کرتے۔ یہ سب چیزیں ان کے ذہنی ترفع پر شاہد ہیں آپ کی اسلام پسندی کا حال یہ تھا کہ روشن خیال مصنفین کی آراء ان کے لیے باعث اضطراب بن جاتیں۔ روشن خیالیت اور استشراقیت کا ایک ہی منبع ومصدر ہے۔ کیوں کہ تسلیمہ نسرین اور گپ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سلمان رشدی اور شاخت کا ایک ہی ایجنڈا تھا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ انھیں اعلی علیین میں جگہ نصیب ہو، ایسے دردمند اور مخلص استاذ ادارہ سرسید کو ملتے رہیں یقیناً مرنے والے کے اوصاف انگنت تھے۔ راقم الحروف ایسے صاحب اوصاف اور صاحب کمالات کے آسودۂ خاک ہونے پر ملول ہے۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

☆☆☆

ماہنامہ ندائے اعتدال
ایک تحریک کا ترجمان اور ایک مشن کا حامل ہے، آپ بھی اس کا حصہ بنیے۔

==========

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے ضرور بھیجیے۔

Eamil:

nidaeaetidal@gmail.com

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: تعلیم اسلام

مؤلف: مولانا ندیم احمد انصاری

صفحات: ۳۴۴

ناشر: ادارہ الفلاح باندرہ، ممبئی

قیمت: (درج نہیں)

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

تعلیم الاسلام کے نام سے پہلے بھی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور تقریباً سب ہی متداول و مقبول ہیں، یہ الگ بات کہ ہر ایک میں تسہیل احکام اور قارئین کے معیار و تقاضوں کا الگ الگ اعتبار سے خیال رکھا گیا ہے، زیر نظر کتاب جو مولانا ندیم انصاری صاحب کی مرتب کردہ ''تعلیم الاسلام'' ہے وہ کئی حیثیوں سے ممتاز ہے، بہت مختصر بھی نہیں ہے اور بہت زیادہ ضخامت بھی نہیں ہے، تقریباً روزمرہ پیش آنے والے مسائل بلکہ ان تمام باتوں کا احاطہ کرنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے جن سے ایک مسلمان کا واقف ہونا از حد ضروری ہے، مسائل کا ذکر مختصر مگر واضح انداز میں کیا گیا ہے اور عربی مصادر نیز کتب فتاویٰ سے حوالوں کا عمدہ اہتمام کیا گیا ہے، کتاب کی زبان سادہ و عام فہم رکھی گئی ہے۔

کتاب کو متعدد ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک باب اصطلاحات فقہیہ کے نام سے بھی قائم کر دیا گیا ہے جو کہ قاری کے لئے یقیناً بہت مفید ہے، ابتدا علم اور اہل علم کی فضیلت و اہمیت سے کی گئی ہے، پھر طالبین علم کے آداب بیان کیے گئے ہیں، پھر بنیادی عقائد کے مباحث ہیں، اس باب میں بھی واضح اور مختصر انداز میں بعض وہ جزئیات آگئی ہیں جن کا صحیح علم بہر حال ضروری ہے، اس کے بعد پھر طہارت نماز، روزہ، زکوۃ و حج کے مسائل کو عام مزاج و معیار کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے، آخر کتاب میں مسنون دعائیں، رسول اللہ کی سنتیں اور سیرت رسول اللہ ﷺ سے متعلق تقریباً ۵۰ صفحات ہیں جو شاید دیگر ''تعلیم اسلام'' نامی کتابوں سے اسکو ممتاز کرتی ہیں۔

یہ کتاب عام لوگوں کے لئے تو مفید ہے ہی ساتھ ہی مکاتب کے نصاب کے لئے بھی مفید ہے، مساجد سے منسلک کمیٹی، انتظامیہ اور مؤذنین وغیرہ بھی اس سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں، کتاب کے شروع میں تقریباً ۱۷ علماء کی آراء و توثیقات ہیں جو یقیناً مؤلف کتاب کے متعارف ہونے اور کتاب کے وقار کے لیے سند ہیں، لیکن شاید اس طرح کی کتابوں بلکہ عام کتابوں میں بھی اتنی سندوں اور تقریظات کا یکجا کرنا محض طوالت کا باعث ہے جبکہ اختصار اس دور میں باعث کشش ہے، اگر ان میں سے مؤلف دو-تین حضرات بلکہ ایک کی ہی مفصل رائے پر اکتفا کرتے تو بھی کوئی حرج نہ تھا بلکہ اس سے ضخامت ہی اور کم ہوتی، بہر حال یہ کتاب متعدد خوبیوں سے عبارت ہے، البتہ بعض کمپوزنگ اور بعض پروف کی غلطیاں ہیں جن سے آئندہ ایڈیشن انشاء اللہ مبرا ہوگا۔

کتاب بہ ظاہر مفید ہے اور مؤلف بہر اعتبار لائق مبارکباد ہیں، ضرورت ہے کہ لوگ اس کتاب کو خرید کر اپنے گھروں میں اس طرح رکھیں جس طرح عام ضروریات زندگی رکھتے ہیں اور اس سے بھرپور استفادہ کریں۔ ☆☆☆

نام کتاب: عدالت عظمی کا فیصلہ

صفحات: ۲۶۰

مؤلف: محمد ارشاد حنیف/ابرار حسن ندوی

قیمت: ۳۰۰

ناشر: ایمان میڈیا اینڈ پبلشنگ ہاؤس، دہلی

رابطہ کے لئے:

Mob. 08765048940, 09810041911,
Email: iman.media786@gmail.com

ہم ندائے اعتدال کے صفحات میں اس سے قبل بھی ارشاد حنیف صاحب کے ایمان پبلشنگ ہاؤس کی دو کاوشوں کا تعارف پیش کر چکے ہیں، زیر نظر کتاب میں ان کے تازہ دم اور جواں سال رفیق کار ابرار حسن ندوی صاحب کا خون جگر اور جوش جنوں بھی شامل ہے، یہ کتاب درحقیقت عدالت عظمی کے ذریعہ دیے گئے اس فیصلہ کا اردو ترجمہ (مع اصل انگریزی) ہے جو اکشر دھام مندر کے ملزمین کو بری کرتے ہوئے دیا گیا تھا، اور تفتیشی ایجنسیوں کے کردار پر سوالیہ نشان لگائے تھے، اس میں کوئی شک نہیں یہ کتاب مفید اور معلوماتی ہونے کے ساتھ دستاویزی ہے، عام لوگوں کو قانون سمجھنے نیز حکومتی ایجنسیوں کا کھیل سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی، اس فیصلہ کا ترجمہ یوں بھی ضروری تھا کہ اس سے بہر حال عدالتوں کے کردار پر کچھ اعتماد بحال ہوتا نظر آیا، لیکن سوال یہ ہے کہ اعتماد کی بحالی کے لئے جب تک سپرم کورٹ کا فیصلہ آیا تب تک یہ ملزمین اپنا کیا کچھ نہ کھو چکے تھے، فیصلہ کے بعد اس کتاب کے منظر عام پر آنے تک اور کتنے اندر ہو چکے تھے، اور کیا یہ کتاب آئندہ اس طرح کی کتابیں نہ آنے پر قدغن لگا سکے گی، یہ وہ سوالات ہیں جو مترجمین کتاب کو قائدین ملت سے ضرور کرنا چاہیے اور پوچھنا چاہیے کہ ادھوری پالیسی یا یک رخی قیادت کب تک لوگوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلتی رہے گی۔

جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے تو یہ اپنی متعدد خوبیوں کے ساتھ ارشاد صاحب کے پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہونے والی دوسری کتابوں کی طرح معیاری ہے، البتہ بہ نسبت ان کی دیگر کتابوں کے اس کا اردو ترجمہ جملوں کی ترتیب کے اعتبار سے ذرا غیر مرتب اور گنجلک محسوس ہوا، فہرست کی کمی شدید طور پر محسوس ہوئی لیکن پھر بھی اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کاوش بے حد مفید ہے، خود سابق چیف جسٹس آف انڈیا جناب التمش کبیر نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے اور اپنے مقدمہ میں مترجمین کو مبارکباد دی ہے۔

فی الحقیقت ارشاد حنیف صاحب ایک نظریہ رکھتے ہیں، وہ قانون کی ہر چیز کو اردو میں منتقل کر کے عام شخص کو جو اردو سے واقف ہو قانون سے واقف کرا دینا چاہتے ہیں، ساتھ ہی وہ مدارس کے متخصصین فقہ کو اردو میں قانون پڑھا کر عدالتوں میں دیکھنے کے خواہاں ہیں کہ شاید اس سے لٹے پٹے مظلومین کے درد کا کچھ مداوا ممکن ہو سکے، ورنہ فیس یا اجرت کے نام پر عدالت میں جو حال ہوتا ہے خدا کرے کہ اس سے کبھی کسی کا سابقہ نہ پڑے، ہماری خواہش بھی ہے اور ہم قوم سے اپیل بھی کرتے ہیں کہ وہ ایسے مخلص انسانوں کا ساتھ دے اور ہر طرح سے ان کی معاونت کر کے اس ضرورت کو پورا کرے جس کا گزشتہ کچھ سالوں سے احساس بہت شدید ہو گیا ہے، ہم اپنے عزیز دوست ابرار حسن کو بھی مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کا جوش جنوں انہیں اب تک حصول تعلیم کی راہ پر گامزن کیے ہوئے ہے، اور وہ کچھ کر گزرنے کے جذبہ سے سرشار ہیں، خدا انہیں کامیاب کرے، حق کی حمایت اور حق بیانی ان کا شیوہ ہو اور وہ حق کی ترجمانی کی علامت بن جائیں اور اس طرح وہ قانون داں علماء کے درمیان ترجمان حق کے طور پر پہچانے جائیں۔☆☆☆

نام کتاب: ارشاد السلیم الی علوم الحدیث النبی الکریم۔

صفحات: ۲۴۶۔

مصنف: ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی۔

ناشر: راعیل اکیڈمی علی گڑھ۔

ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ علی گڑھ، دار الکتاب دیوبند۔

تبصرہ نگار: محمد طارق رامپوری ندوی

احادیث رسول ایک ایسا بیش بہا خزانہ ہے جس پر امت مسلمہ کو فخر ہے، اس خزانہ کو جمع کرنے، اس کی حفاظت کرنے اور اس کو خزف ریزوں سے پاک کرنے کے لئے لاکھوں جانثاروں نے اپنی زندگی کو تج دیا۔ اور مکمل احتیاط سے امانت کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا، اس خزانہ کی نقد و تحقیق اور چھان پھٹک سے وہ علوم حدیث وجود میں آئے جن کی نظیر دیگر اقوام میں ملنی ناممکن ہے، اس خزانہ کی حفاظت کس طرح ہوئی، اور کن مقدس ہستیوں کے ہاتھوں یہ خدمت انجام پائی، ان کے حالات زندگی کیا ہیں، اس موضوع پر کون سی کتابیں لکھی گئیں، اس کی اصطلاحات کیا ہیں، یہی تمام موضوعات ہیں جو علوم حدیث کے زیر بحث آتے ہیں اس لئے حدیث کے ہر طالب علم کے لئے ان علوم سے واقفیت ضروری ہے۔

اردو زبان میں اس موضوع پر متعدد کتابیں موجود ہیں، لیکن ان میں صرف اصول حدیث سے متعلق مباحث ملتے ہیں، فن اسماء الرجال، فن جرح و تعدیل، فن تخریج اور درایت حدیث جیسے اہم موضوعات تشنہ رہ جاتے ہیں، یہ بات بھی بالکل بجا ہے کہ جو شخص بھی ان علوم سے واقف ہونا چاہتا ہے تو لامحالہ اس کے لئے عربی زبان سیکھنی ضروری ہے، اس لئے دیگر زبانوں میں اسکی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی، پھر بھی ڈگری حاصل کرنے والے کم استعداد طلبہ کو نصاب کی تیاری کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں علوم حدیث کے تمام اہم گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہو۔

زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہے، جس میں فن حدیث کے بنیادی علوم کو عام فہم انداز میں بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، یہ کتاب ۶ ابواب پر مشتمل ہے، اور ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں۔

باب اول حدیث اور تدوین حدیث پر مشتمل ہے، جس میں مدلل انداز میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ بغیر کسی انقطاع کے تدوین حدیث کا کام ہر دور میں ہوتا آرہا ہے، جس کے ثبوت لئے عہد نبوی عہد صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے صحیفے اور رسالے کافی ہیں اور وہ احادیث حسن سے کتابت حدیث کی ممانعت معلوم ہوتی ہے، وہ حقیقتا ابتدائی زمانہ کی ہیں، اور ان کا مقصود یہ تھا کہ کہیں قرآن کی طرف توجہ کم نہ ہو جائے، اور جب یہ خدشہ دور ہو گیا تو پھر آپ ﷺ نے اس کی اجازت مرحمت فرمادی۔

باب دوم میں صحت و ضعف کے لحاظ سے کتب احادیث کے چار طبقات بیان کرتے ہوئے طبقہ اول میں موطا کو اول درجہ میں جبکہ صحیحین کو ثانوی درجہ دیا ہے یہی قول شاہ ولی اللہ کا بھی ہے اور عین انصاف کے مطابق ہے، طبقہ دوم میں صحاح ستہ اور مسند احمد بن حنبل کو رکھا ہے، ابن ماجہ کے حوالے سے یہ بات خاص طور سے ذکر کی ہے کہ صحت کے لحاظ سے صحاح ستہ میں ابن ماجہ کے بجائے سنن دار قطنی کو رکھنا چاہیے تھا، لیکن بعض محدثین نے ابن ماجہ کی حسن ترتیب کو دیکھتے ہوئے صحاح ستہ میں جگہ دے دی، اور پھر یہی قول زیادہ مشہور ہوا، صاحب کتاب کی یہ بات دلیل کے اعتبار سے مضبوط معلوم ہوتی ہے، طبقۂ سوم میں ایسی کتب کو بیان کیا ہے جس میں ہر طرح کی احایث موجود ہیں اور علماء امت کے درمیان وہ زیادہ متداول بھی نہیں ہیں جیسے مصنف عبدالرزاق، المعجم الکبیر، المعجم الصغیر، المعجم الوسیط وغیرہ طبقہ چہارم میں ایسے لوگوں کی روایات کو بیان کیا ہے جنہوں

نے اپنے مواعظ میں یا اپنے مذہب کی تائید کے لئے اسرائیلی روایات کو احادیث اور اپنے اجتہادات کو قول نبی کی شکل دیدی ہے۔

باب سوم میں اسماء الرجال سے بحث کی گئی ہے، جس میں اس کی ضرورت اور اس کی افادیت بیان کی گئی ہے اور ان موضوع پر کام کرنے والے افراد اور اس پر لکھی جانے والی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

باب چہارم میں جرح وتعدیل کو بیان کیا گیا ہے اس کی مشروعیت اور عہد صحابہ وتابعین میں اس کی مثالیں ذکر کی گئی ہیں، اس موضوع کی تصنیفات کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس معاملہ محدثین کی دیانت داری بلکہ حیران کن دیانت داری کے واقعات پیش کیے گئے ہیں، اس کے بعد اسباب عدل واسباب جرح پر روشنی ڈالی گئی ہے، الفاظ جرح و تعدیل اور بعض ائمہ فن مخصوص اصطلاحات سے واقفیت کرائی گئی،

باب پنجم میں فن تخریج کا تعارف اس کا طریقہ کار مختصراً ذکر کیا گیا ہے باب ششم میں درایت حدیث پر بحث کرتے ہوئے خاص طور سے اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ کا نقطۂ نظر اس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے ان کے اجتہادات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

فاضل مصنف اپنی کاوش میں بجا طور سے کامیاب رہے، البتہ کتاب کا نام کچھ اس طرح ہونا چاہیے تھا جس سے فن کا پتہ چلے جبکہ موجودہ نام ''ارشاد السلیم إلی معرفۃ علوم الحدیث النبی الکریم'' میں ''الحدیث النبی الکریم'' کو ترکیب کے لحاظ سے کسی بھی طور سے صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بہر حال کتاب اردو داں طبقہ اور مبتدی طلبہ کے لیے بے حد مفید ہے، کئی ضخیم اور قیمتی کتابوں کی تلخیص اس میں آگئی ہے اور علوم حدیث کے گوشوں کا مختصر وبہتر تعارف پیش کر دیا گیا ہے۔☆☆☆

نام کتاب: **ربنا**

(قرآن کی وہ چالیس دعائیں جن میں ''ربنا'' کا لفظ آیا ہے)

مرتب: عبدالرحمٰن کوندو

ہدیہ: ۵۰ روپے

صفحات: ۱۱۲

ناشر: جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر

تبصرہ نگار: محمد فرید حبیب ندوی

یہ کتاب دراصل کچھ مخصوص دعاؤں کا مجموعہ ہے، مرتب نے قرآن پاک کی وہ چالیس دعائیں جن میں ''ربنا'' کا لفظ آیا ہے اس کتاب میں جمع کر دی ہیں، ان دعاؤں سے پہلے ۵۸ صفحات پر مشتمل مرتب کا مقدمہ ہے، جو بڑا اہم اور قیمتی ہے، اس مقدمہ میں دعاء کی فضیلت اور اذکار و ادعیہ کے چند مجموعوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ لفظ رب کی تشریح مفصل انداز سے کی گئی ہے، تیس صفحات پر مشتمل لفظ رب کی یہ تشریح بڑی ہی چشم کشا اور مفید ہے، لفظ رب پر مختلف مفسرین کے کیے گئے تفسیری حواشی نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ربوبیت کے تعلق سے چند گمراہانہ فرقوں کی تردید، نیز اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، مقدمہ کے آخر مین انبیاء علیہم السلام اور خصوصا حضور پاک ﷺ کے ذریعہ مانگی گئی وہ دعائیں جن میں لفظ رب استعمال ہوا ہے درج کر دی گئی ہیں، پھر ''ربنا'' کی چالیس دعائیں مع ترجمہ درج ہیں، اور آخر میں مختصر مگر جامع انداز میں مختلف تفسیروں کے حوالے سے ان دعاؤں پر حواشی تحریر کئے گئے ہیں جن سے افادیت دوبالا ہوگئی ہے۔

۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب خوبصورت سرورق اور رنگین و دیدہ زیب کاغذ کی وجہ سے معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہے، کتاب کی اہمیت افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۳ء تک اس کے دس ایڈیشن نکل چکے ہیں، اللہ تعالیٰ مرتب کو جزاء خیر دے۔ ☆☆☆

آخری صفحہ

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!

شعبان کی پندرہویں شب کو عرفِ عام میں شب برأت (براءت کی رات) کہتے ہیں ماہنامہ ندائے اعتدال کا یہ شمارہ جب آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو توبہ واستغفار کی یہ رات آپ سے بالکل قریب ہوگی، اس رات میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کا سلسلہ سرِ شام ہی سے شروع ہوجاتا ہے اور صبح تک جاری رہتا ہے اور بے شمار گناہگاروں کو بخش دیا جاتا ہے، مگر اس رات میں کاہن، جادوگر، شرابی، والدین کا نافرمان، زانی، حاسد، رشتے توڑنے والا اور ٹخنے سے نیچا کپڑا لٹکانے والا خدا کی بخشش عام سے محروم رہتا ہے، ہاں اگر یہ لوگ اپنے ان گناہوں سے توبہ کرلیں تو محروم نہیں رہیں گے اور خدا کی رحمت ومغفرت انہیں اپنی آغوش میں لے لے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم لوگ اپنے آپ کو اس رات خدا کی رحمت ومغفرت کا مستحق بنا رہے ہیں یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا نام بھی ان لوگوں کی فہرست میں ہو جو اس مبارک رات میں بھی خدا کی بخشش عام سے محروم رہتے ہیں، اگر ایسا ہے تو ہم فوراً گناہوں سے توبہ کریں اور والدین، رشتہ داروں اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں جلدی کریں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

یقیناً یہ رات رحمتوں، برکتوں اور مغفرتوں کی رات ہے، یہ وہ رات ہے جس میں خود خدائی دینے اور نچھاور کرنے پر آتی ہے، اس رات میں مانگنے والا ہاتھ تو تھک سکتا ہے مگر دینے والا ہاتھ بغیر کسی ادنی تھکاوٹ کے پوری فراخی کے ساتھ دیتا ہی چلا جاتا ہے۔

لہذا اس مبارک رات کو انفرادی عبادت میں گزارا جائے اس طرح نمازیں پڑھی جائیں، قرآن کی تلاوت کی جائے مغفرت چاہی جائے اور اللہ تعالیٰ سے از سرنو پیمان وفا باندھا جائے۔ جن کی فرض نمازیں باقی ہیں انہیں اس رات نفل نمازوں میں مشغول ہونے کی بجائے فرض نمازوں کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس رات کے آخری حصہ میں مردوں کے لئے قبرستان جاکر دعائے مغفرت کی جائے۔ بعض علماء اس کے قائل ہیں کہ پندرہویں شعبان کا روزہ مستحب ہے اس لیے اس دن روزہ بھی رکھے اس کے ساتھ ۱۳/۱۴ تاریخوں کو شامل کرلے تو بہتر ہے۔

احادیث سے ماہ شعبان کے جو خصوصی اعمال ثابت ہیں وہ یہی ہیں۔ اس کے علاوہ جن بہت سی باتوں کا اہتمام کرتے ہیں شریعت میں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بندۂ مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کے احکام کو بس سمجھے اور باقی کو ہوس۔

(م۔ق۔ن)

☆☆☆